# میرے شہر کی خوبصورت

# کرشن چندر

مصنف

کرشن چندر

# میرے شہر کی قلوپطرہ

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

اشاعت اوّل :- ——— ۱۹۸۱ء
تعداد :- ——— ۱۰۰۰ ہزار
منتظم :- ——— عشرت ممتاز
ناشر :- ——— عبدالرحمٰن
طباعت :- ——— ناظر پرنٹنگ پریس کراچی

قیمت :- ● روپے

# میرے شہر کی قلوپاطرہ

کرشن چندر

ممتاز پبلشرز

۱۴۴- اردو بازار کراچی

| نمبر شمار | عنوان | صفحہ |
|---|---|---|
| ۱ | کرشن چندر کی افسانہ نگاری | ۵ |
| ۲ | سیٹھ جی | ۱۸ |
| ۳ | ڈنر | ۲۵ |
| ۴ | میرے شہر کی مکلوپطرہ | ۳۹ |
| ۵ | دُرگت | ۵۴ |
| ۶ | چوراہے کا کنواں | ۶۲ |
| ۷ | ایک دوست کی موت پر | ۷۱ |
| ۸ | عقیدت نامے | ۹۵ |
| ۹ | مونگ کی دال | ۱۰۲ |
| ۱۰ | ہندی کا نیا قاعدہ | ۱۱۱ |

# کرشن چندر کی افسانہ نگاری

ڈاکٹر سرور اکبر آبادی
پروفیسر شعبۂ اردو گورنمنٹ اسلامیہ کالج

اردو میں افسانہ اور بالخصوص مختصر افسانہ نگاری کا آغاز انیسویں صدی سے ہوتا ہے۔ اردو میں یہ صنف انگریزی ادب کے اثر سے داخل ہوئی۔ انگریزی زبان وادب کی ترویج و اشاعت نے اردو ادب کو بھی متاثر کیا اور اس میں بھی نئے نئے رجحانات و خیالات کا اضافہ ہوتا گیا۔ اس طرح انگریزی ادب کے مطالعہ ورواج نے اردو کے ادیبوں کو بھی افسانہ نگاری کی طرف مائل کیا۔

دکنی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو اردو کے افسانوی ادب کے آغاز کا زمانہ ساڑھے تین چار سو سال تسلیم کیا جائے گا۔ لیکن افسانے سے داستان تک کے دور کی صحیح منازل کا تعین کرنے میں اب بھی انداز و خیال اور تامل سے کام لیا جاتا ہے مگر اس سلسلے میں، میں آپ کی توجہ اس طرف ضرور دلاؤں گا کہ مورخ ابتدائی دور کے انسان کو وحشی اور بربر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مگر آج کی یہ تہذیب و تمدن، کلچر و ثقافت، عروج و ارتقاء اور شعر و ادب سب

اسی وحشی و بربر انسان کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ چونکہ انسان فطری طور پر تغیر پسند و جدت طراز واقع ہوا ہے۔ اس لئے ہر نئی بات اور ہر نئی چیز اس کو اپنی طرف مائل کر لیتی ہے۔ لہٰذا انسان بھی خوب سے خوب تر کی جستجو میں لگا رہا۔ اور جیسے جیسے وہ نئی نئی چیزوں اور نئی نئی باتوں کو دریافت کرتا گیا وہ اپنے ماحول اور حالات کو سنوارتا گیا اس نے سماج و معاشرہ کی تشکیل کی اور اُصول و قوانین بنائے اور خیالات و تصوّرات کو حقیقتوں اور صداقتوں کا جامہ پہنایا۔ حاتم طائی۔ الف لیلیٰ۔ گل بکاؤلی۔ گل صنوبر، داستانِ امیر حمزہ اور طلسم ہوشربا وغیرہ ایسے ہی دور کی کہانیاں ہیں۔ جب انسان خلاؤں میں گھورتا اور خیالوں میں کھویا رہتا تھا۔

ایسی داستانوں اور قصّوں کو رواج دینے میں ہمارے جاگیردارانہ نظام کا بھی بڑا گہرا ہاتھ ہے۔ اس دور میں فرصت و فراغت میسّر تھی۔ لوگ وقت گزاری اور تفریحِ طبع کے لئے طول طویل داستانیں سننے اور سنانے میں بڑا لطف لیتے تھے۔ آج کے اس مشینی اور مصروف ترین دور میں جب ہم اُن داستانوں کو دیکھتے ہیں تو بڑی حیرت ہوتی ہے کہ ان لوگوں کو ایسی داستانیں لکھنے لکھانے اور سننے سنانے کا موقعہ کیسے میسر آجاتا تھا۔ مگر عصرِ جدید کی ترقی و تحقیق اور سائنس کی ایجادات نے آج ان باتوں کو بھی ممکن و موجود بنا دیا ہے۔ جو کل تک، غیر ممکن و ناقابلِ یقین تھیں۔ انسان اب خواب کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں آچکا ہے۔ لہٰذا آج کے دور میں وہ انہی باتوں اور افسانوں کو سننا پسند کرتا ہے جو حقیقت سے قریب اور قرینِ قیاس ہوں۔

انیسویں صدی میں جب انگریزی ادب کو رواج ملا تو موپساں، ٹالسٹائے چیخوف اور میکسم گورکی وغیرہ کے افسانوں کے ترجمے ہونے لگے۔ یہ افسانے بعید از قیاس اور مافوق الفطرت باتوں سے دور اور حقیقتوں سے قریب تھے۔ ہمارے ادیبوں اور افسانہ نگاروں نے بھی ان مغربی افسانہ نگاروں سے متاثر ہو کر افسانے لکھنے شروع کئے۔ مگر ان میں سے بیشتر افسانے یا تو مغربی افسانوں کا ہو بہو نمونہ ہیں یا تھوڑے سے تغیّر و تبدّل کے ساتھ بنے بنائے سانچوں میں ڈھال لیے گئے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں میں صرف منشی پریم چند وہ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے مغرب کے صحت بخش افسانوی ادب کے رجحانات و اثرات کو اخذ کر کے مشرقی ماحول کے رُجحانات و روایات میں سمویا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تمام افسانے اصلاحی و مقصدی ہونے کے ساتھ ساتھ فنّی اعتبار سے بھی بہت بلند نظر آتے ہیں اور انہیں بیک وقت عوامی و ادبی افسانوں میں فخر سے شمار کیا جا سکتا ہے۔ پریم چند جانتے تھے کہ کوئی بھی افسانہ جو ادبی کیف و کم، رنگ و نقش اور زور و اثر کا حامل نہ ہو اور انسان کے لطیف جذبات و احساسات کو متاثر نہ کر سکے وہ افسانویت کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ پریم چند کے علاوہ اس دور کے دوسرے ممتاز و معروف افسانہ نگاروں میں اختر حسین رائے پوری، سجاد حیدر یلدرم۔ ل۔ احمد اکبرآبادی سلطان حیدر، جوش۔ نیاز فتح پوری۔ اعظم کریوی۔ مجنوں گورکھپوری، علی عباس حسینی اور اختر اورینوی کے نام نمایاں ہیں۔ مگر اس دور کے افسانہ نگار زیادہ تر رومانی تحریک سے متاثر تھے۔

۱۹۳۵ء میں ترقی پسند تحریک کی ابتدا ہوئی۔ اس کے ابتدائی دور میں

جو افسانے لکھے گئے اس میں پریم چند کے افسانے "کفن" کو اس دور کا بہترین افسانہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب ایک تہذیب مٹ رہی تھی اور ایک نئی تہذیب جنم لے رہی تھی اور ایک نئے انقلاب کے قدموں کی آہٹ قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ اب رومانیت کی جگہ سیاسی و سماجی اور اقتصادی و معاشرتی مسائل نے لے لی تھی۔ اس دور کے سبھی افسانہ نگاروں کے افسانوں میں سماجی ناانصافیوں، ظلم و زیادتیوں اور معاشرے کی خرابیوں کا ذکر ملتا ہے جن میں محمد حسن عسکری، ابوالفضل صدیقی، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ انصاری اور کرشن چندر نمایاں ہیں۔

کرشن چندر نے جدید افسانے کو جو عروج بخشا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعہ سماج و معاشرہ کی مکروہ و دلدوز تصویریں پیش کیں۔ انہوں نے محلاتی رنگ رلیوں اور سازشوں کے قصے سنانے کی بجائے شہروں و قصبوں، بازاروں دہاتوں اور تنگ و تاریک گلیوں کے نقشے ایسے دلکش اور حسین انداز سے پیش کئے کہ جلد ہی عوام سے سندِ قبولیت حاصل کر لی۔

گذشتہ جنگ عالمگیر کے بعد سے ملک میں جو کساد بازاری، مفلسی و ناداری اور سماجی بے چینی پیدا ہوئی تھی۔ وہ اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ نوجوانوں کو اپنا مستقبل تاریک نظر آتا تھا۔ ماحولِ گرد و پیش بھی ایسا تھا کہ جس میں ننگے بھوکے فاقہ زدہ اور مدقوق چہرے سینہ سکیڑے اور ہاتھ پھیلائے نظر آتے تھے۔ بڑھتی ہوئی مشکلات کو دیکھ کر ضروریات زندگی کی تکمیل کے لئے عورت بھی گھر سے باہر

نکلنے پر مجبور ہوگئی اور اب وہ بھی کار زارِ حیات میں مرد کے دوش بدوش چلنے کھڑی ہوئی۔ یہی باتیں تھیں جن سے متاثر ہو کر کرشن چندر نے، زندگی کے موڑ پر، دل کا چراغ۔ بے رنگ و بو۔ دو فرلانگ لمبی سڑک، برفان، انگور، ان داتا۔ بالکونی طلسم خیال، ٹوٹے ہوئے تارے اور نظارے جیسے افسانے لکھے۔ جن میں انہوں نے محبت و اخلاق اور سیاست و معاشرت پر بڑا گہرا طنز کیا ہے۔ انکے افسانوں کی مقبولیت کا یہی ثبوت کافی ہے کہ ان کی کئی ناولیں اور افسانوی مجموعے چین، جاپان، جرمنی اور روس کی تقریباً سترہ زبانوں میں ترجمہ کئے جا چکے ہیں۔

جس طرح پریم چند نے اپنی زندگی میں ہی اپنے افسانوں کی مقصدیت و دلکشی کے سبب عوام سے سند قبولیت حاصل کر لی تھی۔ اسی طرح کرشن چندر نے بھی پریم چند کے فن کو آگے بڑھانے کے ساتھ ساتھ اس میں نئی نئی راہیں استوار کیں۔ انہوں نے فنی چابکدستی اور شعورِ اظہار کے وسیلے سے سماج و معاشرہ کے رستے ہوئے ناسوروں کی واضح نشاندہی کی ہے۔ جن کا تدارک کر کے مستقبل میں معاشرہ کو صحت مند اصولوں پر تشکیل کیا جا سکتا ہے۔ ان کے یہاں رومان و حقیقت، غمِ جاناں و غمِ دوراں اور اصلاح و مقصدیت دوش بدوش ہیں۔

کرشن چندر کو کشمیر اور بمبئی سے بڑا گہرا تعلق رہا ہے اور ان کی عمر کا بیشتر حصہ انہی حسین فضاؤں اور اسی رنگین ماحول میں گزرا ہے۔ لہٰذا وہ کشمیر کی رومان پرور فضاؤں اور دلکش وادیوں کے حسن اور مناظر قدرت کی نیرنگیاں دکھا کر قاری کی دل بستگی کا سامان فراہم کرنے کے علاوہ اس کو سماجی ناہمواریوں اور زمانے کی تلخ حقیقتوں سے بھی ضرور روشناس کراتے ہیں۔ کیونکہ اس کے پس منظر

میں پائی جانے والی تاریک و گھناؤنی حقیقتوں کو بھی انہوں نے بغور دیکھا ہے۔ بمبئی جو جگمگاہٹوں اور روشنیوں کا شہر ہے۔ وہاں کی عفونت و غلاظت پر بھی ان کی نظر ہے وہاں کے تڑپتے و سسکتے انسانوں کے ناگفتہ بہ حالات اور حیوانوں و شیطانوں کے مذموم کارناموں پر بھی کرشن چندر نے چند در چند طنز کر کے تاریکیوں میں بھی اک نئی مشعل جلائی ہے۔

ان کے تمام افسانے دورِ حاضر کی نظر کو خیرہ کر دینے والی کھوکھلی تہذیب اور معاشی بدحالیوں کا بیان ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے سیاسی و سماجی اور اقتصادی و معاشرتی مسائل پر روشنی ڈالتے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کا موضوع و پلاٹ اور تار و پود ہماری عام اور روزانہ کی زندگی میں رونما ہونے والے حادثات و واقعات اور واردات و معاملات سے ہی اخذ کرتے ہیں۔ جن سے مزدور و کسان، مفلس و جفاکش لوگوں کی زندگیوں کا نقشہ نظر میں پھر جانے کے علاوہ بہت سے لوگوں کی عیاریاں و مکاریاں اور چالاکیاں و فتنہ پردازیاں بھی نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔ کرشن چندر کی جو بات خصوصیت سے متاثر کرتی ہے وہ ان کی انسان دوستی اور خلوص ہے۔ ان کے یہاں دوسرے ترقی پسند افسانہ نگاروں کی طرح گھن گرج، غصہ و جھلاہٹ، بدمزاجی اور چڑچڑے پن کی بجائے ایک طرح کا ہلکا سا طنز ملتا ہے۔ جس سے قاری مسکراتا بھی جاتا ہے اور دل پر چوٹ بھی پڑتی جاتی ہے۔ وہ بڑی گہری نظر سے جزویاتِ زندگی کا مشاہدہ کرتے اور ان کو نہایت سادگی و پرکاری سے افسانوں میں سحر دیتے ہیں۔ ان کی نظر معاشرہ کے ہر ادنیٰ سے ادنیٰ عیب

اور معمولی سی معمولی خامی تک کو بڑی خوبی اور دانائی سے دیکھ لیتی ہے یہی سبب ہے کہ وہ ہماری تہذیبی و تمدنی، سماجی و معاشرتی سیاسی و اقتصادی اور انسانی و اخلاقی کمزوریوں کو بڑی بے باکی و ذرّاکی سے منظر عام پر لے آتے ہیں۔ انہوں نے اپنے معجزۂ فن کو اپنے خونِ جگر سے رنگ بھر کر نکھارا ہے۔ انہوں نے خود کڑیاں جھیلی اور بڑے بڑے تلخ تجربات کئے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ آج برصغیر ہندوپاک کیا بلکہ دیگر ترقی پسند ممالک کی ترقی یافتہ زبانوں میں بھی ان جیسا عظیم افسانہ نگار مشکل ہی سے نظر آئے گا۔

انہوں نے افسانے میں داخلیت سے کام لے کر اس کو ایک نیا رنگ و آہنگ بخشا ہے۔ لکھنے والا چاہے کتنا ہی لائق و فائق کیوں نہ ہو لیکن افسانے کو حقیقی رنگ نہیں بخش سکتا تو اس کو افسانہ لکھنے کا کوئی حق نہیں۔ کرشن چندر اس راز سے پوری طرح واقف ہیں وہ قاری پر اپنا مقصد واضح کرنے کے لئے احساس و جذبات کی تمام شدت اور ترغیب و تحریص کی تمام کوششیں صرف کر دیتے ہیں۔ مگر ان کا سب سے بڑا حربہ ان کا سماج پر چند در چند طنز ہے۔ طنز کا یہ نشتر معاشرے کے رنگے

سیاروں، بگلہ بھگتوں اور ریاکار زاہدوں کے دلوں کو گھنگولتا، چیرتا، پھاڑتا اور ان پر نمک پاشی کرتا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ان کا یہی طنز افسانے کو حقیقت کا روپ دے کر اسے زندگی سے اور قریب کر دیتا ہے۔

مثال کے طور پر ان کے افسانے "یرقان" کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

"شیاما بہت حسین تھی۔ اس لئے چاہنے والے بھی بہت تھے۔ وہ بیاہی ہوئی تھی اور یہاں میکے آئی ہوئی تھی۔ عاشقوں کے وافر ہونے کی یہ بھی ایک وجہ تھی۔

اس کا باپ مر چکا تھا اور اس کی والدہ اپنے زنڈا پے میں بھی سہاگن کی شان اور جوانی کی آن کو قائم رکھے ہوئے تھی۔ اس امر نے بھی شیاما کے عاشقوں کی تعداد میں معتد بہ اضافہ کر دیا تھا اور ان تمام امور کا شیاما کو بھی بخوبی احساس تھا۔ اس کے شریف اور باعصمت ہونے کی ایک یہ بھی وجہ تھی۔

ہمارا قصبہ بہت چھوٹا ہے۔ اتنا کہ اس میں صرف پانچ حکیم، تین ڈاکٹر اور دو وید پریکٹس کرتے ہیں۔ سوڈا واٹر کی صرف ایک دوکان ہے۔ ملائی کی برف بیچنے والا بھی ایک سے زیادہ نہیں اور وہ ایک نوجوان ہے۔ منچلا اور شیاما کا چاہنے والا۔ شیاما کی ماں اس سے ہر روز پاؤ آدھ پاؤ ملائی کی برف مفت کھا جاتی ہے۔ صرف دو درزی ہیں۔ ایک بیچارا سیدھا سادہ آدمی ہے وہ قمیض کی سلائی دو آنے تک خوشی سے قبول کر لیتا ہے دوسرا راولپنڈی پاس ہے۔ اس نے تین سال تک راولپنڈی میں ایک مشہور و معروف انگریزی"

"ٹیلرنگ شاپ" میں کام سیکھا ہے وہ سلائی صرف اتنی طلب کرتا ہے۔ جتنی کپڑے کی قیمت ہو۔ ہمارے قصبے کے نوجوان اس سے بڑے شوق سے کپڑے سلاتے ہیں۔

ہمارے قصبے میں ایک مڈل اسکول ہے۔ پہلے پرائمری تک ہی تعلیم دی جاتی تھی۔ مڈل کلاسیں اس سال کھلی ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب، نو وارد ہیں۔ خوبصورت خوش طبع نوجوان ہیں۔ گاتے خوب ہیں۔ پیار و قوال کی" مَن تو شدم تو مَن شُدی" انہیں بہت مرغوب ہے۔ شیاما کے گھر کے پاس سے گزرتے وقت انہیں اکثر گنگناتے بلکہ صاف گاتے ہوئے سنا گیا ہے۔ شیاما بھی کبھی دریچے میں بیٹھ کر سن لیتی ہے۔ اس کے چہرے پر اس وقت ایک عجیب سی مسکراہٹ ہوتی ہے۔ جوشِ رقابت میں، میں اسے محبت سے تعبیر کرتا ہوں۔

ہمارا قصبہ نائب تحصیلدار صاحب کا صدر مقام ہے۔ وہ مجسٹریٹ بھی ہیں اور طبیب بھی ان کی غیر معمولی ہر دلعزیزی کا بڑا بھاری سبب یہی ہے کہ وہ فارسی اچھی خاص جانتے ہیں اور ادیب بھی ہیں۔ شیاما کو خالص فنی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے اور پرکھنے کے عادی ہیں اور اس پر اس انداز سے تنقید کرتے ہیں گویا شیاما، شیاما نہیں، زندہ عورت نہیں بلکہ لڈگیو کا ایک مرمریں مجسمہ یا پھر ماطلی سیلی کی پر کیف تصویر۔

ہمارے قصبہ میں باوا تہمن گرو کا استھان بہت مشہور ہے۔ عقیدت مند روحیں جو اکثر اناث سے تعلق رکھتی ہیں انہیں صرف "باواجی" کہہ کر ہی پکارتی ہیں۔ باواجی کی جوانی ڈھل چکی ہے۔ مگر ہر بات میں جوانوں سے آگے

قدم دھرتے ہیں۔ چرس کا دم لگاتے ہیں۔ شراب پیتے ہیں اور شیاما سے افلاطونی محبت رکھتے ہیں۔ قد لانبا، جسم اکہرا اور رنگ بگلے کی طرح سفید ہے"

کرشن چندر کے افسانے کے اس اقتباس سے ہمارے سامنے معاشرہ کے ادنیٰ و اعلیٰ، خاص و عام، عورت و مرد، بوڑھے و جوان سب ہی قسم کے لوگوں کے افکار و تخیلات اور افعال و کردار پوری طرح سامنے آجاتے ہیں۔ اس افسانہ میں عشق و محبت کی چاشنی بھی ہے اور جنسی پکار کی گونج بھی اور ہمارے سماج کے بہت سے طبقوں کے لوگوں کی زندگی کے حقیقی پہلو بھی جلوہ گر ہیں۔ اس میں کرشن چندر نے ہمارے سامنے ان لوگوں کو بھی لا کھڑا کیا ہے۔ جن کو ہم بظاہر بڑی عزت و احترام اور تعظیم و تکریم کی نظر سے دیکھتے ہیں مگر جب حقیقت پر نظر جاتی ہے تو ان کے قلب و نظر کتنے ادنیٰ و پست نظر آتے ہیں۔ یہ کرشن چندر کی فنکاری ہی ہے کہ وہ ہماری کھوکھلی تہذیب و معاشرت پر چاروں طرف سے بھرپور وار کرتے چلتے ہیں۔ یہاں کرشن چندر نے اپنے مشاہدات و محسوسات کے توسّل سے حالات و واقعات کی مختلف و منتشر کڑیوں کو ملا کر جس چابکدستی سے اپنے تاثرات پیش کئے ہیں۔ وہ قاری کی فکر کو بیدار کرنے کے لئے کافی ہیں۔ ان کے الفاظ و فقرے بڑے بلیغ و معنی اور نئے انداز کے حامل ہوتے ہیں۔ ان میں جو تازگی و ندرت اور لطافت و حلاوت ہوتی ہے وہ قاری کو ایک دم چونکا دیتی ہے۔ مثلاً اُن کا یہ کہنا کہ :-

" نائب تحصیلدار صاحب مجسٹریٹ بھی ہیں اور طبیب بھی۔

شیاما کو خالص فنی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے اور پرکھنے کے عادی

ہیں اور اس پر اس انداز سے تنقید کرتے ہیں کہ گویا شیاما۔ شیاما نہیں بلکہ لڈگیو کا ایک مرمریں مجسمہ ہے۔"

یہ ٹکڑا ان کے عمیق مطالعہ۔ گہرے مشاہدے اور عالمانہ واقفیت کا واضح ثبوت ہونے کے ساتھ ساتھ زبان کی لطافت و حلاوت، تشبیہ کی جدت و ندرت اور موضوع و طرز بیاں کی ہم آہنگی کی عمدہ مثال ہے۔

کرشن چندر نے بہت سے اچھوتے و انوکھے اور نئے نئے موضوعات کو اپنایا ہے اور سماج و معاشرہ کے ہر ہر پہلو کو اجاگر کرنے کی طرف توجہ دیکر افسانوی ادب میں نئی نئی راہیں متعین کی ہیں۔ ان کے ایک اور افسانے "دو فرلانگ لمبی سڑک" سے ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

"کچہریوں سے لے کر لا کالج تک بس یہی کوئی دو فرلانگ لمبی سڑک ہوگی۔ ہر روز مجھے اسی سڑک پر سے گزرنا ہوتا تھا۔ کبھی پیدل کبھی سائیکل پر۔ سڑک کے دو رویہ شیشم کے سوکھے سوکھے اور خشک درخت کھڑے ہیں۔ ان میں نہ حسن ہے اور نہ چھاؤں سخت کھردرے تنے اور ٹہنیوں پر گدھوں کے جھنڈ ہیں۔ سڑک صاف سیدھی اور سخت ہے۔ متواتر نو سال سے اس پر چل رہا ہوں، نہ اس میں کبھی کوئی گڈھا دیکھا نہ شگاف سخت سخت پتھروں کو کوٹ کر تیار کی گئی ہے اور اب اس پر کولتار بھی بچھا ہے۔ جس کی عجیب سی بو گرمیوں میں طبیعت کو پریشان کر دیتی ہے۔"

بظاہر یہ ایک عام اور معمولی سی سڑک کا بیان ہے اور اس میں کسی طرح کی کوئی دلچسپی اور حسنِ بیان کی ضرورت نہیں مگر کرشن چندر کی فنکاری و پُرکاری دیکھئے کہ انہوں نے اس میں بھی علامات کے ذریعہ زمانے کی تمام تلخیاں و سختیاں سمو دی ہیں۔ اس سے ہم زندگی کی تلخی و کرختگی، زمانے کی کھُردراہٹ و دردراہٹ، دھوپ اور چھاؤں اور سر پر منڈلاتے ہوئے مصائب و آلام کے گِدھوں کی موجودگی کا احساس بخوبی کر سکتے ہیں۔ اس سڑک کے دو رویہ سوکھے اور خزاں نصیب درخت مظلوم و مفلس انسانوں کی علامت ہیں۔ جن پر بہار میں بھی خزاں چھائی رہتی ہے۔ جن کے لئے دھوپ اور چھاؤں سب یکساں ہیں۔ اس سے معاشرہ کے سنگدلانہ رویہ کی کیسی واضح تصویر نظر میں پھر جاتی ہے۔

کرشن چندر ہر طبقہ اور ہر سطح کے انسان کی جبلت و فطرت اور نفسیات و مزاج سے واقف ہیں اور ایک نباض و حاذق طبیب کی طرح اس کی دکھتی رگ پر ہی ہاتھ رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں حاکم و محکوم، تاجر و آجر، کسان و مزدور امیر و غریب، محنت کش و سرمایہ دار، مزارع و جاگیردار، بیوہ و بیسوا اور یتیم و فقیر سب ہی قسم کے لوگوں کے واقعات مل جاتے ہیں۔ وہ معاشرہ کے امیروں و رئیسوں کی پُراسرار زندگیوں کے حالات، ان کے ایر پھیر، اور عیّاری و مکاری کی چالوں سے بھی خوب واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ بڑے لوگ چھوٹے لوگوں کو لوٹنے اور فریب دینے کے کیا کیا طریقے ایجاد کرتے رہتے ہیں اور بعض تہذیب و تمدّن اور مذہب و ملت کے ٹھیکیدار مذہب کے

نام پر کیسی کیسی لوٹ مار مچائے رکھتے ہیں۔ جھوٹی شان و شوکت، سستی عزت و شہرت اور قول و فعل کے تضاد کو بھی انہوں نے اپنے افسانوں میں بڑے موثر انداز سے پیش کیا ہے۔

غرض یہ کہ کرشن چندر اس دور کے ایک ایسے منفرد افسانہ نگار ہیں۔ جو پہلو میں ایک درد مند دل رکھتے ہیں انہیں سماج و معاشرہ کا استحصال کرنے والوں سے سخت نفرت اور یتیموں و بیواؤں اور کسانوں و مزدوروں سے بہت محبت ہے۔ ان کے افسانوں سے انسانوں کا درد و کرب نمایاں ہے۔ وہ چونکہ خود بڑے حساس و غیرت مند ہیں۔ اس لئے انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے وقت بھی وہ بڑے حزم و احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ ان کے افسانے رومان و حقیقت کا ایک حسین سنگم اور دلکش و دلآویز ہیں، ان کے یہاں اگر کہیں کہیں محبت کا جنسی رجحان بھی ملتا ہے، تو اس میں عظمت و تقدیس مدِ نظر رہتی ہے۔ ان کے بعض افسانے اشاریت و علامیت کے بھی حامل ہیں۔ جن سے ان کی جہاں گردی و دیدہ وری، زبان و بیان پر عبور و قدرت اور شعورِ اظہار کی برجستگی و بے ساختگی جھلکتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے اردو افسانے کے جدید رجحانات کو ایک نیا رخ دیکر ایسے افسانے تخلیق کئے ہیں۔ جن پر حقیقت کا گمان گزرتا ہے اور یہی اک افسانہ نگار کے فن کی معراج ہے۔

# سیٹھ جی

سیٹھ جی کے ہونٹ بڑے بڑے اور موٹے بھدے تھے۔ ان کی ناک لمبی اور ٹیڑھی تھی۔ آنکھوں میں شیطانوں جیسی مکاری جھلک رہی تھی۔ میں جب ان کے دفتر میں پہونچا تو وہ فوراً اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بڑے تپاک سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہنے لگے۔ آہا آہا آپ آئیں ہیں! ارے بھئی کشن جی آئے ہیں ایک کرسی اندر بھجوا دو۔

ایک چپراسی کرسی لے کر آیا میں اس پر بیٹھ گیا۔ میں نے سیٹھ جی کے مسکراتے ہوئے چمکتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے ان کے چہرے پر بناسپتی گھی کا ڈبہ الٹ دیا ہے۔ یہ مسکراہٹ اسی گھی میں تلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ سیٹھ جی نے اپنے پیلے پیلے دانت نکالے۔ اپنے ہاتھ ملے اور ایک عجیب باریک سی ہنسی سے جو کسی شیطانی گھوڑی کے ہنہنانے سے مشابہت رکھتی تھی کام لیتے ہوئے بولے۔ ارے واہ! ہم بڑے خوش قسمت ہیں۔ کشن جی آئے ہیں۔ میں نے ہری چند بھائی سے کہا تھا کہ کشن جی کبھی ملیں تو ہمارے پاس بھیج دینا۔ آپ تو کبھی آتے ہی نہیں۔ ارے بھئی لاکہہ دو۔ لاکہہ کی

بات ہی کیا ہے یہ غرض تو جب چاہو پوری کر لینا ہم سے۔ تم نے تو ملنا ہی چھوڑ دیا ہے
میں نے کہا میں آج سے چھ مہینے پہلے اس کام کے واسطے آپ کے پاس حاضر ہوا
تھا۔ آپ نے اتنے پھیرے کر دیئے کہ میرے جوتے کے اندر کا موزہ بھی گھس گیا۔

ہاہاہا سیٹھ صاحب ہنستے ہوئے بولے آپ بڑے خوش مزاج معلوم ہوتے ہیں
جوتے کا اندر کا موزہ بھی گھس گیا۔ ہاہاہا۔ ایسا مذاق تو ہم نے کسی فلم میں بھی نہیں سنا
اس کو لکھ ڈالو نا کسی فلم کے لئے۔ تمہاری قسم ہے فلم بہت چلے گی۔ ہاہاہا ہنستے ہوئے
سیٹھ جی کی آنکھیں بند ہو گئیں اور ان کے پیٹ میں درد ہونے لگا۔

جب اچھی طرح ہنس چکے تو گھنٹی بجاتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ کچھ پیئے گا۔ ٹھنڈا
ونڈا۔؟ ہاں! ٹھنڈے سوڈے میں وہسکی ڈال کر پیوں گا۔

اس کے بعد اس نے پھر ہنسنا شروع کر دیا۔ ایک لڑکا سیٹھ کی آواز سنکر اندر آیا
اور اپنے سیٹھ کی بے ہودہ ہنسی دیکھ کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ جب یہ طوفان رکا۔ تو
سیٹھ نے لڑکے سے کہا دو اچھی وہٹو لاؤ۔ بوتلیں لاؤ۔

جب لڑکا چلا گیا تو آپ میز پر جھک کر میری طرف دیکھ کر کہنے لگے میں چاہتا ہوں
کہ آپ روپے مجھ سے سوا لاکھ کی جگہ ڈھائی لاکھ لے لیں لیکن پکچر ایسی ہو بالکل کلاسیکل ہو۔

میں نے کہا کلاسیکل سے مطلب آپ کا کلاسیکل میوزک ہے شاید۔ بہت اچھا میں
دلیپ چندر بیدی سے گذارش کروں گا کہ وہ اس کا میوزک سنبھال لیں۔

نہیں نہیں سیٹھ جی بولے آپ میرا مطلب غلط سمجھے آپ ایک ایسی پکچر بنائیں جو کلاسیکل
ہو یعنی جس کا جواب دینا میں نہ ہو آپ سمجھ گئے نا میرا مطلب۔؟ ایک دم فائن سمجھے :
سمجھ گیا۔ لیکن ایسی فلمیں ہندوستان میں دیکھے گا کون۔؟ دیکھئے اس سے قبل ہم تین پار

بار تجربہ کر چکے ہیں۔ ایک تو بنگال کے رہنے سہنے کے متعلق فلم تھی۔ ملکی اور غیر ملکی نامہ نگاروں نے اس فلم کو دیکھا اس کی بہت بہت تعریف کی۔ روس، امریکہ، انگلینڈ کے فلم بینوں نے بھی اس کی بہت تعریف کی۔ لیکن یہاں کہیں بھی تین چار ہفتے سے زائد نہیں چلی۔ آپ ایسی ہی فلم چاہتے ہیں نا۔!

نہیں، نہیں ایسی پکچر کیا کرنی ہے اپنے کو۔؟

تو پھر ایک فلم وہ تھی جس میں غریبی اور امیری کا جھگڑا خوبصورتی کے ساتھ نبھایا گیا تھا۔ اداکاروں نے اچھی طرح اپنے پارٹ ادا کئے تھے۔ ڈائریکٹر نے بھی بڑی محنت سے وہ فلم بنائی تھی۔ ہندوستان میں بنی تھی، لیکن جب فرانس میں اس کو ریلیز کیا گیا تو وہاں کے باشندوں نے اسے اس سال کی بہترین فلم قرار دیا۔ لیکن ہندوستان میں وہ ابھی تک ڈبوں میں بند ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں تو میں.....

باپ رے؟ میں نے ایسی پکچر کے لئے کب کہا ہے؟ میں تو کچھ اور.....

میں نے کہا۔ تو پھر آپ تیسری پکچر چاہتے ہیں۔ جس میں ڈانس اور گانے پبلک کی پسند کے تھے۔ لیکن اس کی کہانی ریاستی جاگیرداروں کے خلاف تھی۔ جس کی وجہ سے کئی ریاستوں میں اس کا دکھایا جانا ممنوع قرار دیا گیا اور ڈسٹری بیوٹر بنانے والے کی جان کو آج تک رو رہا ہے مگر پکچر اچھی خاصی تھی۔ ریاستی عوام کی زندگی کا صحیح جائزہ۔

سیٹھ گھبرا کر بولے اپنے کو یہ جھگڑالو فلم نہیں چاہئے اپنے کو تو ایک سیدھی سادھی پکچر..... میں نے بات کاٹ کر کہا۔ تو ایک وہ پکچر ہے بڑی سیدھی سادھی محبت کی کہانی ہے مگر اس کا پلاٹ ہے زمین کسانوں میں بانٹ دو۔ پکچر تین بار سنسر ہوئی آخر میں نہ تو زمین کسانوں کے پاس رہی اور نہ کسان رہے۔ خالی خولی محبت کی کہانی رہ گئی۔ شہد لگا کر چاٹنے کیلئے۔

سیٹھ جی بولے۔ نہ بابا۔ باز آیا۔ ایسی فلم اپنے کو نہیں چاہئے۔ نہیں تو ایک کوڑی نہ دونگا۔ میں تو ایسی کلاسیکی فلم چاہتا ہوں جیسے کھڑکی۔ سنتوشی۔ شہنائی۔

میں نے کہا۔ کھڑکی اور شہنائی تو فلمیں ہیں۔ لیکن سنتوشی کوئی فلم نہیں ہے وہ تو کھڑکی اور شہنائی کے ڈائریکٹر کا نام تھا۔

ہاہا سیٹھ جی صاحب ہنستے ہوئے بولے۔ دیکھا کشن جی ناموں میں کیسی گڑبڑ ہو جاتی ہے پھر وہ ایک دم چونک کر بولے مگر سنتوشی نام بھی برا نہیں ہے۔ فلم کا نام سنتوشی رکھ دیں تو کیسا رہے گا۔ ؟

نام تو اچھا ہے مگر سنتوشی صاحب آپ پر دس لاکھ کا دعویٰ کر دیں گے۔

اچھا جی! سیٹھ صاحب کرسی پر تلملائے۔ تڑپے اور ایک دم سُن ہو کر بیٹھ گئے جیسے ان کے سامنے ساری دنیا میں اندھیرا چھا گیا ہو۔

میں نے کہا سنتوشی نام تو نہیں البتہ "بے ہوشی" نام کیسا رہے گا۔ (بیہوشی) سیٹھ صاحب کرسی سے اچھل پڑے۔ زور سے ہاتھ ہلاتے ہوئے بولے واہ واہ کشن جی کیا نام سوچا ہے۔ ؟ بیہوشی، بڑا اچھا نام ہے۔

میں نے کہا اس میں جتنے کیریکٹر ہیں بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ ہیرو۔ ہیروئن۔ ویلین ستیاسی۔ سائڈ ہیرو۔ سائڈ ہیروئن سب لوگ ایک ایک گانا گاتے ہیں اور گاتے ہی سب بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ یہ کیسا آئیڈیا ہے سیٹھ۔ ؟

کمال کر دیا کشن جی! مگر کتنے گانے رکھئے گا آپ۔ ؟

میں گانے بہت رکھوں گا۔ کیونکہ کیریکٹر بہت ہیں نا۔ اور پھر ہر گانے کے بعد بے ہوشی ہو گی گویا ہر بار نیا ڈرامہ پیدا ہو گا۔ میں تو سمجھتا ہوں سیٹھ جی کہ پکچر لگتے ہی ہال میں

ساری پبلک بے ہوش ہو جائے گی۔

واہ، واہ! سیٹھ جی خوشی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولے۔ نیا آئیڈیا ہے۔ ایک دم نیا۔ میں ابھی ادبیرا ہاؤس بک کرتا ہوں اس کے لئے۔

میں نے کہا ہاؤس تو بہت اچھا ہے لیکن پبلک کی بے ہوشی کے لئے ذرا چھوٹا رہے گا۔ کوئی بڑا سا ہال لیجئے اور وہاں سے کرسیاں ہٹوا دیجئے تاکہ لوگ پکچر دیکھنے جائیں اور وہیں فرش پر بے ہوش ہوتے جائیں۔ ذرا دیکھئے کیسی باکس آفس ہٹ پکچر بنتی ہے۔ لیجئے ابھی چیک کاٹ دیجئے۔

چیک تو دیتا ہوں لیکن اس میں میرا شیئر رہے گا۔ پکچر بھی گروی رکھوں گا اور سود اور رائلٹی بھی لوں گا۔

میں نے کہا سب منظور ہے۔

وہ بولے ایک اور شرط ہے اس پکچر میں میرا شیئر نہ ہے اس لئے میں نہیں چاہتا کہ پکچر کے درمیان کوئی شرارت ہو اور ہمارا نام بدنام ہو۔

وہ کیسے ہوگا۔؟ میں نے پوچھا۔

وہ ایسے کہ اسٹوڈیو کے اندر کوئی شراب نہیں پئے گا۔ کوئی سگریٹ نہیں پئے گا۔ کوئی لڑکیوں کی طرف بری نظر سے نہیں دیکھے گا۔

میں نے کہا یہ تو سب ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔ مگر شراب کے لئے.... ذرا اتنی مشکل ہے کہ اگر میرے خیال میں کوئی ایک آدھ پیگ پی کر آجائے تو اسے کیسے روک سکتے ہیں۔؟ ایک آدھ پیگ تو ڈاکٹر بھی زبردستی پلا دیتے ہیں بیمار کو۔

سیٹھ نے کہا۔ ارے ایک آدھ پیگ کی کیا بات ہے وہ تو ٹھیک ہے خیر! میں چیک لکھتا ہوں۔

وہ چیک لکھنے لگے۔ میں نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کھنکار کر کہا، اور سگریٹ سے تو مجھے سخت نفرت ہے۔ ہر وقت منہ سے تمباکو کی بدبو آتی رہتی ہے جیسے آپ کے منہ سے پیاز کی بو آرہی ہے اور.....

سیٹھ جی ایک دم چونک کر بولے۔ کیا میرے منہ سے پیاز کی بو آرہی ہے۔؟

بو نہیں بلکہ بدبو آرہی ہے۔

سیٹھ نے غصے میں گھنٹی بجائی۔ چپراسی آیا۔ چپراسی سے کہا باورچی کو بلاؤ۔ باورچی آیا سیٹھ اس پر برس پڑے۔ بدمعاش۔ سالے۔ تو نے بتایا نہیں کہ آج دال میں بھنی ہوئی اتنی پیاز ہے کہ میرے منہ سے بدبو آرہی ہے۔ سیٹھ جی مجھے کیا معلوم۔؟

تجھے معلوم نہیں۔ سالے دس سال سے ہمارے ہاں کام کر رہا ہے اور تجھے یہ معلوم نہیں کہ میں بھنی ہوئی پیاز نہیں کھاتا ہوں۔ کیا جنگلی کے موافق گدھا ہے۔ نکل جا۔ ابھی جا۔ منیم جی سے حساب چوکتا کر لے۔ باورچی سر جھکائے چلا گیا۔

میں نے کہا بات پیاز کی نہیں سگریٹوں کی ہو رہی ہے۔ اصل میں سگریٹ پینا بہت بری بات ہے لیکن جب کبھی آدمی اسٹوڈیو میں کام کرتا ہے تو کام کی زیادتی کی وجہ سے سستی آجاتی ہے اس لئے سگریٹ پینا بہت فائدہ مند ہے۔

سیٹھ نے کہا نہیں نہیں میں ایسے سگریٹ پینے کو تھوڑی ہی منع کرتا ہوں۔

باقی رہی لڑکیوں والی بات تو بھلا ان پر کون بری نظر سے دیکھتا ہے۔ لڑکیوں کو بری نظر سے دیکھنا بہت بری بات ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ سچی محبت کو کون روک سکتا ہے۔ جہاں مرد اور عورت ملیں گے وہاں سچی محبت بھی ہوگی جیسا کہ آجکل فلم انڈسٹری میں ہزاروں بڑے بڑے پروڈیوسروں سے لیکر معمولی ایکسٹرا لوگوں تک میں ہو چکا ہے ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے دو

دو شادیوں کے بعد بھی سچی محبت کی ہے اب اس چیز کو روکنا تو بہت مشکل ہوگا۔

سیٹھ جی میں سچی محبت کو کب منع کرتا ہوں۔ اپنی خود ایک بار اس جھنجھٹ میں پھنس گئے تھے۔

میں نے آنکھ دبا کر کہا سچ مچ سیٹھ جی؟ آپ بھی؟ یقین نہیں آتا۔

قسم لے لو کشن جی تمہارے سر کی قسم جو جھوٹ بولتا ہوں تو... وہ.... ہائے.....

میں مرگئی فلم کی ہیروئن نہیں۔ نہیں ہیروئن نہیں سائڈ میں کون سی لڑکی تھی۔؟ جو گیشوری ہاں ہاں جو گیشوری سے ہمیں محبت ہوگئی بڑھتے بڑھتے دو تین بچے بھی ہوگئے۔ اب وہ کولابا میں ہے میں اس کو خرچہ پانی دیتا ہوں بالکل اپنی بیوی کی طرح لگتی ہے۔ اب ایسی محبت کو کون منع کرتا ہے میں یہ تھوڑی کہتا ہوں کہ بالکل ہی کمیونسٹ ہو جاؤ۔

میں نے کہا وہ تو ظاہر ہے کہ آپ کا یہ مطلب تو نہیں ہو سکتا۔

سیٹھ جی چیک انگلیوں میں گھما کر بولے کشن جی میں یہ کیا سن رہا ہوں کمیونسٹ چین کو لے گئے۔

ہاں لے گئے۔ اور ادھر ملایا میں بھی ان کی بدمعاشی چالو ہے۔

سنتے تو یہی ہیں۔ آج صبح میں نے خبر پڑھی کہ رنگون سے دس میل ادھر لڑائی ہو رہی ہے۔

میں نے کہا آپ نے ٹھیک پڑھا ہے۔

سیٹھ جی چیک کو انگلیوں میں گھماتے رک گئے۔ انہوں نے غور سے چیک کی طرف دیکھا میرے اور چیک کے درمیان چھ انچ کا فاصلہ تھا۔ سیٹھ جی نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر چیک کو پھاڑتے ہوئے کہا۔ کشن جی اب ہمارا دھندہ نہیں چلے گا۔ اب یہ سودا کرنے کا وقت نہیں ہے۔

---

# ڈنر

سیٹھ پرومن چومکھی بے حد دیانت دار صنعت کار تھا۔ شہر میں اس کے سات کارخانے تھے۔ گیارہ بلڈنگیں تھیں۔ پانچ داشتائیں تھیں اور ایک بیوی تھی۔ صبح و شام وہ اپنے کام میں مصروف رہتا کیونکہ وہ ایک مصروف آدمی تھا۔ لنچ پر وہ صرف ایک گلاس پھلوں کے رس کا پیتا تھا۔ کیونکہ اس سے زیادہ کھانے کے لئے اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ ہر روز شام کے چھ بجے سے سات بجے تک وہ ایک گھنٹہ باری باری اپنی مختلف داشتاؤں کے ساتھ گزارتا تھا۔ ساڑھے سات بجے اپنے گھر پہنچ جاتا تھا۔ باقی سارا وقت اس کی بیوی اور بچوں کا ہوتا تھا۔ وہ اپنے بیوی بچوں سے بے حد محبت کرتا تھا۔ اس کی بیوی کا نام سمتی تھا۔ بچوں میں تین تو لڑکے تھے۔ بڑا گووند اور اس سے چھوٹا نند و بزنس میں اس کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ سب سے چھوٹا ہنس مکھ لڑکا اپنی بہن کامنی کے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا۔ سب سے چھوٹی لڑکی منیا ابھی چھ سال کی تھی۔ وہ سب لوگ رات کا کھانا اکٹھے کھاتے تھے۔ دن بھر کھانا نہ کھانے سے اور لگاتار ڈٹ کر کام کرنے سے پرومن چومکھی کی بھوک بھی چمک

اٹھتی تھی۔ شام کے وقت رات کے نو بجتے بجتے اس کے لئے اپنی بھوک کا مقابلہ کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ آج اسے اپنی ایک داشتہ کے ہاں پندرہ منٹ زیادہ ہو گئے۔ اس لئے جب اس کی گاڑی پورچ میں رکی اور سمتی اسکے استقبال کیلئے بڑھی تو پیار کی رسمی باتوں کو ترک کرتے ہوئے وہ فوراً چلایا۔

مجھے سخت بھوک لگی ہے۔

سمتی نے مسکرا کر کہا۔ ڈنر تیار ہے۔

ڈنر کی گانگ بجی۔ ڈائننگ ہال کے باہر واش بیسن میں ہاتھ دھو کر نئے مصفا تولیئے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اس نے نہایت بے صبری سے پوچھا۔

کیا پکا ہے۔؟

سمتی کے چہرے پر اطمینان کی مسکراہٹ پھیل گئی۔ بولی۔

کیا چاہیئے؟ جو بولو گے حاضر ہو جائے گا۔

ہوں..... ہوں..... دیکھتے ہیں تمہاری آج کی کارگزاری..... وہ ڈائننگ ہال کے اندر آتے ہوئے بولا

پھر پردمن چومکھی نے میز کا جائزہ لیا۔ جو شادی کی دعوت کی طرح سجی تھی۔ اور ہر روز اسی طرح سجتی تھی۔ اس وقت چومکھی کی آنکھیں اور نتھنے بڑی تیزی سے کام کر رہے تھے۔ باپ رے! کتنی سخت بھوک لگی ہے اور کھانے کے لئے ہے کیا۔؟ مگر سب کچھ تو ہے۔ چکن ریشمی کباب، چکن برہ اور چکن مصالحہ، تین طرح کے تو چکن ہیں بھنا ہوا تیتر ہے، سبزیوں میں مکھن میں دم دے کر پکایا ہوا ثابت گوبھی کا پھول ہے جو اسے بہت پسند ہے۔ ساگ پنیر ہے۔ ٹن اسٹیک ہے۔ دہی کی بوندیاں، دھلی

ہوئی ماش کی دال، ایک ایک دانہ ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں کی طرح الگ الگ، لیجئے یہ روسٹ ران بھی رکھی ہے اور پشکہ چاولوں کا اور چاول بھی اعلیٰ ترین باسمتی کے۔ جسینی باسمتی جو صرف دہرہ دون کے چند گاؤں میں بوئی جاتی ہے۔ یہ پشکہ؟ پلاؤ اور خشکے کے بیچ کی چیز ہے۔ اس لئے سمتی نے اس کا نام پشکہ رکھا ہوا ہے۔ یہ اس کے خاوند کی مرغوب غذا ہے۔ پشکہ نہ تو بریانی ایسا مرغن ہوتا ہے۔ نہ خشکے کی طرح پھیکا۔ دونوں کی بہترین خوبیاں اس میں پائی جاتی ہیں۔ پھر تین طرح کا میٹھا تھا۔

پردمن نے میز دیکھ کر اطمینان کی سانس لی اور اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب تک دوسری گانگ بج چکی تھی۔ سب لوگ اپنی اپنی کرسیوں پر آ چکے تھے۔ پردمن، سمتی، گووند، نندو، کامنی، ہنس مکھ اور مینا۔ کھانے پر حملہ شروع ہو گیا۔

صحت سب کی عمدہ دکھائی دیتی تھی۔ اچھی صحت والے آدمی کی پہچان ڈنر ٹیبل پر فوراً ہو جاتی ہے۔ کیسے کھاتے پیتے، ہرے بھرے چہرے تھے۔ سب کھانے میں جٹے ہوئے تھے۔ جٹے ان مصروف کلرکوں کی طرح چل رہے تھے۔ جن کے سر پر مالک کھڑا ہو۔ چاندی کے چمچوں سے سالن نکالا جا رہا تھا۔ کالی کالی چمکتی ہوئی آنکھیں فرائی لیور کی طرح تھیں، ہونٹ ریشمی کباب، گال پھولے پھولے تازہ دم کلچے۔

دس منٹ تک کوئی نہیں بولا۔

پھر جب معدہ آدھا بھر گیا تو چونکھی نے منہ پر ہاتھ رکھ کر ایک چھوٹی سی ڈکار لی۔ اور کہا۔

میں نندو کو انگلینڈ بھیج رہا ہوں۔

سمتی نے چاندی کے کانٹے سے کھیلتے ہوئے کہا۔ کیوں۔؟

یہاں پلپ کے کارخانے میں دو مشینیں ٹوٹ گئی ہیں۔ فوری طور پر دو نئی مشینوں کی ضرورت ہے۔ خود پسند کر کے لے آئے گا۔

نندو کا چہرہ اپنی مسکراہٹ چھپائے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ انگلینڈ تک اس کا پہلا سفر ہوگا۔ بیروت تک تو وہ ہو آیا تھا۔ مگر لندن! وہ اپنی پلیٹ میں مرغی کی ایک ٹانگ رکھے عالمِ تصور میں مغربی حسیناؤں کی ننگی ٹانگوں سے کھیلنے لگا۔

کامنی بولی۔ میں کالج میں ایک ڈرامہ کر رہی ہوں، مجھے تین ہزار روپے چاہئیں۔

کالج کے ڈرامے پر جو خرچ آئے گا کیا وہ خود کالج ادا نہیں کرے گا؟

نہیں! کامنی بولی۔ ڈیڈی بات یہ ہے کہ کالج کی جو آفیشل ڈرامہ کلب ہے۔ اس میں مجھے سکریٹری نہیں چنا گیا۔ اس لئے میں نے دوسری ڈرامہ کلب کھول لی ہے۔ میں ان کو شکست دینا چاہتی ہوں۔

تمہیں رقم مل جائے گی زیادہ کی ضرورت ہو تو اور مانگ لینا۔

تھینک یو ڈیڈ!

---

شری پرومن چومکھی جب کالکا میل سے علی گڑھ اسٹیشن پر رکے تو ہزاروں آدمی ان کو لینے کے لئے اسٹیشن پر موجود تھے۔ پرومن چومکھی اس بار اپنی بیوی سمتی کو بھی ساتھ لائے تھے۔ کیونکہ جب وہ دوسرے شہروں اور قصبوں میں اپنی عزت، شان، جلسے جلوس وغیرہ کا ذکر کرتے تو ان کی بیوی کو مطلق یقین نہیں آتا تھا۔

مسٹر چومکھی عرصے تک ٹونڈلے میں ایک غیر معروف وکیل کی حیثیت سے اپنی زندگی اور موکلوں کے مقدمے خراب کرتے رہے۔ آخر ایک روز دماغ میں لہر آئی اور وہ کانگریس

میں داخل ہو گئے۔ برسوں کی دبی ہوئی تیزی، چالاکی اور شاطری ایک دم زور دے کے ابھری اور وہ ہینڈلوم انڈسٹری کے سرکردہ لیڈر مان لئے گئے۔ ان کے بڑے لڑکے گووند کو ٹیڑھی گڑھوال میں فروٹ کیننگ انڈسٹری کھولنے کے لئے ایک معقول رقم گورنمنٹ کوآپریٹیو سے عطا کی گئی۔ چند برسوں میں انہوں نے ٹونڈلے میں ایک عالیشان کوٹھی تعمیر کر لی جو ملک وقوم کی خدمت کا نتیجہ تھی۔

ان دنوں علی گڑھ میں ہینڈلوم انڈسٹری کی سالانہ نمائش ہو رہی تھی۔ اس سلسلے میں شری چونکھی اپنی دھرم پتنی کے ہمراہ تشریف لائے تھے۔

سمتی، ان کی دھرم پتنی نے جوان کی آؤ بھگت علی گڑھ میں دیکھی تو اس کی آنکھیں کھل کر رہ گئیں۔ وہ کچھ کہتی مگر اس وقت اسے بھوک نے بے تاب کر رکھا تھا۔ دبی زبان میں اس نے اپنے شوہر سے اسٹیشن پر کہا بھی مگر شوہر نے یہ کہہ کر ڈانٹ دیا۔

"ابھی تو جلوس نکلے گا۔ ابھی بھوجن کیسے ہوگا۔ بھوجن تو وہاں ہوگا۔ جہاں ہم ٹھہر جائیں گے۔

"مگر مجھے تو سخت بھوک لگی ہے۔

"توبہ کرو۔ قوم کی خدمت میں بھوکا بھی رہنا پڑتا ہے۔

بڑا لمبا جلوس تھا۔ بڑے اونچے نعرے تھے۔ بے حد موٹی دبیز گرد تھی۔ جب جلوس نشان محل کے باہر پہنچا جہاں لیڈر لوگ ٹھیرائے جاتے تھے، اس وقت تک سمتی کا گورا رنگ راستہ کے گرد وغبار کے میک اپ سے چاکلیٹ رنگ ہو چکا تھا۔ مگر بھوک اس قدر تیز تھی کہ اس نے اپنے چہرے کا خیال نہ کرتے ہوئے فوراً بھوجن کے لئے آرڈر دے دیا۔

شری پردمن چومکھی جو ہوٹلوں میں جاکر خفیہ طور پر گوشت، چکن، کباب، سب کھاتے تھے اور سب کچھ پیتے بھی تھے اس وقت ہاتھ جوڑ کر نمرتا پوروک دنے کی۔

"ہم شدھ سالتوک بھوجن کھاتے ہیں۔

کوٹھی کے مالک پنڈت ہردے دیال نے جواباً عرض کیا۔

"جو دال دلیا ہوگا، حاضر کر دیا جائے گا۔

یاد رہے، چومکھی نے پھر یاد دہانی کرائی کہ بہت سادہ کھانا ہو اور بہت ہی کم۔ ہم دونوں کو اس وقت بھوک نہیں ہے اور بھوک ہو بھی تو ہم بہت کم کھاتے ہیں۔ ایسی ہی عادت ہے ہماری مہاراج۔!

چوکیوں میں چاندی کے تھالوں میں سوئیے نے کھانا پروس دیا۔ کشمیری دم آلو تھے۔ مصالحے بھرے ٹنڈے تھے۔ آلو مٹر بھری شملہ مرچ تھی۔ فرائی پرول۔ تین طرح کی دالیں تھیں دال اڑد، دال ارہر اور دال مسور۔ دہی بڑے تھے اور ہری بھنڈی کھٹے میں تیار کی گئی اور مٹر کا پلاؤ اور تلے ہوئے کیلوں کے پاپڑ یا۔ آم رس اور پانچ چھ قسم کے اچار اور دس بارہ اقسام کی مٹھائیاں چاندی کے ورق لگے ہوئے۔ ساتھ میں آلو بھرے پراٹھے۔ گوبھی بھرے پراٹھے۔ اور مولی بھرے پراٹھے اور عام سادہ پراٹھے مکھن میں تلے ہوئے اور سادہ چپاتیاں اور تنوری نان اور فرائی کٹھل۔ گوشت کے ٹکڑے کی طرح کاٹا ہوا۔ فیرنی اور کھیر اور کچالو کے ٹکڑے مچھلی کی شکل کے کاٹے ہوئے اور موہن بھوگ اور جل جیرا۔

"بے حد سادہ کھانا ہے۔ پنڈت ہردیال نے ہاتھ جوڑ کر معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"بس ایسا ہی کھانا ہم کھاتے ہیں۔ شری چومکھی نے انکساری سے سر جھکا کر تھال اپنے نزدیک کھسکا لیا۔ "پنڈت جی! آپ تو جانتے ہی ہیں۔ ہمارا دیش ایک غریب ملک ہے۔

چومکھی سنٹرل سکریٹریٹ میں تین سو روپے کا کلرک تھا۔ اپنے پانچ بچوں اور ایک بیوی کے ساتھ تین سو روپوں کو بڑی مشکل سے پندرہ دن تک چلا سکتا تھا۔ اس کے بعد ادھار یا خست یا دونوں۔ وہ اس وقت دفتر کی فائلوں سے تقریباً اندھا ہو کر بھوک اور پیاس سے مجبور ہو کر سائیکل چلاتے ہوئے نئی دہلی سے سبزی منڈی کی طرف جا رہا تھا۔ اکتوبر کا مہینہ ختم ہونے کو تھا اور اب منیا کے لئے گرم کپڑے آئیں گے جو چھ سال کی تھی اور پہلی بار اسکول جا رہی تھی۔ بڑا لڑکا گووندی اے پاس کر کے بیکار تھا۔ پھر بھی ہفتے میں دو بار سنیما دیکھتا تھا۔ نندو کی ایک ٹانگ موٹر کے حادثے میں کٹ گئی تھی۔ اس لئے زندگی کے متعلق اس کا نظریہ بے حد تلخ ہو چکا تھا۔ وہ ہر ایک سے نفرت کرتا تھا۔ اپنے ماں باپ سے بھی۔ پڑھنا بالکل بند تھا اور سب کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ مگر کھانا اور کپڑا تو اسے بھی چاہیئے تھا۔ بڑی لڑکی کامنی میٹرک میں دو بار فیل ہو کر گھر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی شادی کی فکر دن رات چومکھی اور اس کی بیوی سمتی کو کھائے جاتی تھی مگر شادی کے لئے روپیہ درکار ہے۔

سڑک پر اس قدر بھیڑ تھی۔ تانگے، موٹریں، چھکڑے، ہاتھ گاڑیاں، رکشے، لاریاں ٹرک، ویگن، کیٹپر، بدبو، سب اور میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے اپنی خواہشوں کی بو سونگھتے ہوئے چوہے اور چھچھوندر نما آدمی اپنی لمبی تھوتھنیاں لٹکائے ہوئے۔ چہرے پر خشونت، بیزاری، مایوسی، تھکن، غصہ، غم اور انتقام کی جھلکیاں لئے ہوئے ظالم بے بس مجبور، کمینے گالیاں دیتے ہوئے چہرے۔ رحم اور امید سے خالی۔ حسن اور شاعری سے عاری پھول اور چاندنی سے ناآشنا، ان سے کلچر کی بات نہ کرنا، پتھر مار دیں گے۔ صرف ان کی صورتیں دیکھو اور ان کی پسلیاں اور گھٹنے کی بے ہنگم ہڈیاں اور آنتیں۔ ٹیڑھی میڑھی پرانی اوداس کی طرح ایک دوسرے سے الجھی ہوئی۔ چومکھی کو ان لوگوں سے بہت

ڈر لگتا تھا۔ جیسے یہ لوگ کسی دوسری دنیا سے آئے ہوئے ہیں۔ وہ دل ہی دل میں ان سے نفرت کرتا تھا۔ کیونکہ اس کی بیوی ہر روز اس کی قمیض کا کالر صاف کر دیتی تھی۔ کیچڑ میں کلبلاتے ہوئے ان کیڑوں سے چونکھی کو سخت نفرت تھی۔ مگر آج اس کا جی کچھ یوں چاہتا تھا کہ وہ بھی اس بھیڑ میں گم ہو جائے۔ کیونکہ آج اسے اپنے دفتر میں دو گھنٹے مزید بیٹھ کر کام کرنا پڑا تھا اور بھوک کا یہ عالم تھا کہ آنتیں اس رسے کی طرح تن رہی تھیں۔ جسے دو مخالف سمتوں سے کھینچا جائے۔ عجب حالت تھی بھوک سے اس کی۔

وہ امرتسری مٹن شاپ کے قریب سے اپنا سائیکل چلاتا ہوا گزرا۔ دفتر سے واپس آتے ہوئے یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ یوں اچھی اچھی دکانوں کے قریب سے گزرنا۔

امرتسری مٹن شاپ میں دہکتے ہوئے سرخ انگاروں کے اوپر بھوری بھوری چانپیں بھونی جا رہی تھیں اور تکے سیخ پر الٹے جا رہے تھے اور چٹ پٹے کباب سرخ ہو رہے تھے۔ وہ موٹریں دکان کے باہر کھڑی تھیں اور کونے میں بیٹھے ہوئے مرد اور عورتیں بھنے ہوئے تندوری مرغ اور پام فریٹ مچھلی کھا رہے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بھوک سے پاگل ہو جائے گا۔ ایک لمحہ کے لئے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سائیکل کو آگے بڑھا دیا۔ وہ ایک ہاتھ گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ ہاتھ گاڑی میں پھل لدے ہوئے تھے، چین کے انگور، قندھار کے انار اور کشمیر کے سیب اور ناشپاتیاں۔ وہ کون لوگ ہیں جو انہیں کھاتے ہیں۔

ہاتھ گاڑی والے نے ایک موٹی سی گالی اسے دی اور دیکھ کر چلنے کو کہا۔ کیونکہ اس طرح بلاوجہ ٹکرانے سے انگوروں کی ایک ٹوکری ہاتھ گاڑی سے الٹ کر

نیچے سڑک پر جاگری تھی۔

پیشتر اس کے کہ ٹریفک کا سپاہی آتا اور لوگ اکٹھے ہوتے۔ چونکھی منہ ہی منہ میں معافی نامہ بدبدا کر سائیکل کو زور سے چلا کر وہاں سے بھاگ گیا۔

مگر گھر جانے کا راستہ جگہ جگہ لالچ اور ترغیب سے بھرا ہوا تھا۔

امرتسر ٹین شاپ کے آگے کوئی ایک سو گز کے فاصلے پر دل بہار ریسٹورنٹ تھا جہاں گرم گرم پوریوں کے ساتھ آلو چھولے ملتے ہیں اور برف میں لگی ہوئی ٹھنڈی رس ملائی اور پنیر مٹر کا پلاؤ اور بیسن میں تلی ہوئی کنول ڈنڈیاں آدمی جب بھوکا ہو یہ سب چیزیں جنت کی نعمتوں سے بھی اعلیٰ معلوم ہوتی ہیں۔ اس سے دو گز کے فاصلے پر بازار میں امراؤ سنگھ حلوائی کی دکان تھی جو مصالحے دار پوریوں کے ساتھ آلو کی بھاجی اور کھٹے کدو کی ترکاری دیتا تھا۔ جسے کھا کر اور دو امرتیاں چکھ کر اوپر سے تازہ عمدہ دہی کا ایک گلاس پی کر آدمی سورگ میں پہنچ جاتا ہے۔ مگر آج بائیس تاریخ ہے اور چونکھی کی جیب میں صرف دو آنے ہیں۔

ہر گام پر چونکھی کی بیزاری بڑھتی گئی۔ بڑی مشکل سے وہ اپنے گھر تک پہنچا جو ایک تنگ و تاریک گلی کے آخری سرے پر واقع تھا۔ دروازے پر پہنچ کر جب اس نے زور سے اپنی سائیکل کی گھنٹی بجائی تو سمتی نے کنڈی کھول دی۔ اس نے آج اپنے بال بڑی احتیاط سے بنائے تھے اور لیموں رنگ کی سوتی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ جو چونکھی کو بہت پسند تھی اور اس کے چہرے پر ایسی شاداب مسکراہٹ تھی کہ معلوم ہوتا تھا ابھی ابھی کسی لال کاغذ کو کاٹ کر اس کے ہونٹوں پر چپکائی گئی ہے۔ یہ سارا ڈھونگ سمتی نے اس لئے کیا تھا کہ آج وہ اپنے خاوند سے لیموں رنگ ساڑھی کے ساتھ چلنے والا ایک بلاؤز مانگنے والی تھی۔

تھکن سے چور ہانپتے ہوئے چومکھی نے سائیکل گھر کے آنگن میں ڈال دی۔

اس کی بیوی نے پوچھا۔ اتنی دیر کہاں رہے،؟

دفتر! چومکھی نے گرج کر جواب دیا۔

سمتی سہم گئی۔ چھوٹی لڑکی منیا جو دھیرے دھیرے اپنے باپ کی طرف قدم بڑھا رہی تھی۔ دیوار سے لگ کر ساکت ہوگئی۔ سمتی نے سوچا آج بلاؤز نہیں ملے گا۔

کھانا تیار ہے؟ چومکھی نے سائیکل کو تالا لگاتے ہوئے پوچھا۔

ہاں تیار ہے۔

کیا پکا ہے۔

ماش کی دال ہے۔ ڈالڈے میں بگھار کے پکائی ہے۔ تم چکھ کے تو دیکھو۔ بہت ہی عمدہ پکی ہے۔

اور؟

اور؟ .... روٹی ہے۔

اور؟ چومکھی پھر گرجا اور دل ہی دل میں اس کا خون ابلنے لگا۔

کبھی کچھ اور نہیں ملتا۔ جب دیکھو دال روٹی۔ روٹی اور دال۔ کبھی ماش کی دال کبھی مسور کی دال، کبھی مونگ کی۔ کبھی ارہر کی، کبھی چنے کی، کبھی سڑا سا ساگ، یا گلی بھنڈی جسے کتے بھی نہ کھائیں۔ مگر آج تو وہ بھی نہیں۔ صرف دال دال دال..... آخری چند دنوں میں مہینے کے آخری روز دال پکتی ہے اور صرف دال ہی کیوں پکتی ہے؟ ایک کٹوری دال کھاؤ، دو چپاتیاں نگلو۔ ٹھنڈا پانی پیو اور سو جاؤ۔

روز دال روٹی، روز دال روٹی، روز دال روٹی۔ وہ سائیکل چھوڑ کر اپنے دونوں ہاتھ

اوپر اٹھا کر چلایا۔ پھر اس نے اپنی سائیکل کو زور سے ٹھوکر ماری اور بڑبڑاتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

کھانے کو کیا ہے؟ چومکھی نے ہل اپنے کندھے سے اتار کر لکڑی کے ایک کھمبے سے اسے اٹکاتے ہوئے اپنی بیوی سمتی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں ہے۔

کچھ نہیں ہے؟ چومکھی نے پھر پوچھا۔

کچھ نہیں ہے! سمتی نے اسی کامل قطعیت سے جواب دیا۔ جہاں زمین ختم ہو جاتی ہے اور آسمان ختم ہو جاتا ہے۔ امیدوں کے کتے رسیاں تڑوا کر بھاگ جاتے ہیں اور آنے والے خدشے خون آشام چمگادڑوں کی طرح گھر کے کونے کھدروں میں پھڑپھڑانے لگتے ہیں اور نگاہوں میں قبرستان کھلنے لگتے ہیں۔

تو بالکل کچھ نہیں ہے؟ رک رک کر پھر چومکھی نے پوچھا۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ گھر میں کچھ نہیں ہوگا۔ پھر بھی بھوک کی شدت اس کی زبان پر ایک ہی سوال لا رہی تھی۔ اس بار سمتی نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔

کیوں نہیں ہے؟ بے معنی سا سوال کیا اس نے۔ سمتی پر چہرے پر ایک طنز بھری مسکراہٹ آ گئی۔ کبھی سمتی بہت خوب صورت تھی۔ اب تو وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی۔ رات اور دن سمتی کے دل بھی یہی سوال آتا تھا مگر اس کا جواب اسے آج تک نہیں سوجھا تھا۔ کیونکہ وہ ایک ان پڑھ گنوار، معصوم، سادہ لوح کسان کی ان پڑھ سادہ لوح بیوی تھی۔ اس لئے یہ سوال اس کے دماغ کے پنجرے میں پھڑپھڑا کے رہ گیا۔

"تو راؤ کے گھر سے مانگ لاؤ۔"

"اس کے گھر میں بھی فاقہ ہے۔

تو محمدو کے گھر ہی سے ....." فقرہ اس سے پورا نہ ہوا کیونکہ وہ پرانے خیال کا تھا۔ چھوت چھات کرتا تھا اور مسلمانوں کے ہاتھ کا نہیں کھاتا تھا۔

محمدو کے گھر میں بھی فاقہ ہے۔

اس کے دیش کو کیا ہو گیا ہے۔ اس کی زمین کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ وہی ملک ہے وہی دیش ہے، وہی زمین ہے جو سونا اگلتی تھی، آج دو دانے گندم کے نہیں اگا سکتی۔ جور گھاٹ سے چار میل پرے ترینا ندی بہتی ہے۔ پانی سے لبالب بھری ہوئی۔ پانی، جو زمین، بیج اور ہرے پتوں کا ساتھی ہے۔ کتنی دفعہ اسکیمیں بنیں۔ مگر ترینا ندی قریب ہی بہتی رہی اور کھیت پانی سے ترستے رہے۔ سنتے ہیں کاغذ پر ایک نہر بنی تھی، ترینا ندی سے اس کھیت تک۔ وہ کاغذ تک ہی رہی۔ دو سال ہوئے نہر کا کام شروع ہوا مگر ٹھیکیدار روپے مار کے کہیں چلا گیا۔ تین سو گز تک نہر کھدی ہے۔ آگے پھر وہی بنجر علاقہ ہے۔ ہائے رام! چاروں طرف کیسی سخت بے رحمی کا سوکھا پڑا ہے۔

یہ سب باتیں وہ جانتا تھا اور بھی بہت سی باتیں۔ جنہوں نے اس کے دل کی ساری خوب صورتی، شاعری، سنگیت، خواب، سپنے، جذبے، احساس اور حسیات ختم کر دیئے تھے۔ بس ان سب کے اوپر ایک ہی احساس غالب تھا۔ وہ بھوکا ہے۔ وہ بھوکا ہے۔

جور گھاٹ میں رات ہو چکی تھی۔ پھوس کے چھتے ہوئے برآمدے میں اس کے گھر میں بانس کے کھمبوں سے لگے ہوئے اس کے گھر کے افراد مایوسی اور تاریکی کے دلدل میں دھنسے ہوئے کھڑے تھے۔ کوئی روشنی، کوئی جدوجہد، نئی زندگی کی کوئی لہر ان تک نہیں پہنچتی تھی۔ وہ اپنی بھوکی آنتوں کی بیڑیوں میں جکڑے ہوئے اپنی کیچڑ بھری دلدل آنکھوں سے ایک ختم نہ ہونے

والے خلا میں تک رہے تھے۔ یہ اس کی بیوی سمتی تھی۔ یہ اس کا لڑکا گووند، وہ دیوار سے لگا ہوا نندو۔ وہ منیا چھ سال کی معصوم بچی۔

کامنی جا چکی تھی۔ چھ ماہ ہوئے اس نے تیرہ برس کی کامنی کو گاؤں کے بنیے کے ہاں ساڑھے چار سو میں فروخت کر دیا تھا۔ اس رقم سے اب تک گھر چلا۔ ڈیڑھ سال پہلے اس نے اپنی زمین کا بہترین ٹکڑا اس بنیے کے ہاں گروی رکھ دیا تھا۔ نو سو روپے میں۔ اب اس کے پاس بیچنے کو کچھ نہیں تھا۔ چھ ماہ پہلے جب بنیے نے کامنی کو خرید لیا تھا تو اس پر ترس کھا کر وہ منیا کو بھی لینے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ گو منیا کی عمر ابھی چھ سال کی تھی۔ مگر اس کے نین نقش کامنی سے بھی اچھے تھے۔

"پچھتر روپے اس کے بھی دے دوں گا۔ بنیے نے اس سے کہا تھا۔

"پچھتر روپے!"

چومکھی نے چاروں طرف دیکھا۔ سمتی بانس کے کھمبے کے پیچھے منہ چھپائے، نندو دیوار سے لگا ہوا اپنے باپ سے منہ موڑ کر، گووند فرش پر بیٹھا ہوا گھاس کے تنکے توڑتا ہوا۔ دبلے پتلے ڈھانچے۔ سب کے سب جانوروں کی طرح بھوکے اور خشمگیں۔

چومکھی نے منیا کی طرف قدم بڑھایا۔

"نہیں نہیں۔ سمتی زور سے چیخی۔

چومکھی نے منیا کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔ منیا سہم کر سسکنے لگی۔

"نہیں نہیں ایسا مت کرو۔ سمتی نے آکر دونوں ہاتھوں سے چومکھی کے پاؤں پکڑ لئے۔ ان پر اپنا سر رکھ دیا اور گڑگڑا کر رونے لگی۔ اسے مت بیچو۔ اسے مت بیچو۔ مجھے بیچ دو مگر اسے مت بیچو۔"

چونکھی نے غصے میں آکر سمتی کو زور سے ایک لات ماری۔ سمتی لڑکھڑا کر پرے جا گری۔

چونکھی منیا کو لیکر گھر سے باہر نکل گیا۔

جو رگھاٹ کی اس رات میں کامل سناٹا تھا۔ زمین بنجر تھی اور آسمان گداگر کے خالی پیالے کی طرح اوندھا پڑا تھا اور اگر کہیں کوئی خدا تھا تو اس نے بھی شرم سے منہ چھپا لیا تھا۔ ایسی بھیانک بے افق بے چھور رات کے تاریک سایوں میں ایک بھوکا کسان اپنی چھ سالہ بچی کا ہاتھ پکڑے ایک پتھریلی پگڈنڈی پر خاموشی سے روتا ہوا چلا جا رہا تھا

# میرے شہر کی قلوپطرہ

جیسے کسی چھوٹے سے کمرے میں کوئی ہیرا پڑا ہو تو سارا کمرہ جگمگانے لگتا ہے۔ اسی طرح کسی چھوٹے سے شہر میں کوئی بے حد حسین عورت پیدا ہو جائے تو سارا شہر اس کے حسن و جمال سے جگمگانے لگتا ہے۔ گلیوں کوچوں بازاروں اور دفتروں میں اس کے تذکرے ہوتے ہیں۔ اگر وہ اپنے محلے سے دوسرے محلے میں جاتی ہے تو سارے شہر میں اس کی خبر پھیل جاتی ہے۔ اگر وہ کبھی کسی بازار سے گزرتی ہے۔ تو گھنٹوں اس چھوٹے سے شہر کے بازار میں کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ کس طرح وہ چل رہی تھی۔ کون سے کپڑے اس نے پہن رکھے تھے۔ کون اس کے ساتھ تھا کس طرف اس کی نگاہ اٹھی تھی۔ ہر بات کا ذکر چلتا رہتا ہے۔ لیکن یہ سب باتیں اسکینڈل پھیلانے کی غرض سے نہیں کی جاتیں۔ ان میں کسی قسم کی بدنیتی یا تلخی بھی نہیں ہوتی۔ بلکہ چھوٹے شہر کے لوگوں میں اس بے حد حسین عورت کے لئے ایک عجیب طرح کا پیار ایک عجیب طرح کی اپنائیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنائیت کے ساتھ یہ غرور بھی ہوتا ہے کہ ہمارے چھوٹے سے شہر نے اسے پیدا کیا ہے۔ وہ عورت اپنے شہر کا قومی زیور

سمجھی جانے لگتی ہے۔ ذراسی اونچ نیچ پر سیخ پا ہو جانے والے بزرگ اور کٹر سے کٹر اخلاق رکھنے والے ڈھیل اس فخر سے اس عورت کی محبتوں اور بے وفائیوں کا ذکر کرتے ہیں جیسے وہ تاریخی کارنامے ہوں۔

معلوم نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ مگر ایسا ضرور ہوتا ہے کہ ایسی عورت عام طور پر اخلاق کی رائج قدروں سے بالاتر سمجھی جانے لگتی ہے۔ شاید وہ خود ایک اخلاقی ضابطہ بن جاتی ہے۔ جس کے اصول عام اخلاقی اصولوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ شاید ایسی عورت اپنے آپ میں خود ایک مذہب یا دھرم ہوتی ہے۔ ایک چھوٹا سا نظام حیات اپنے آپ میں مکمل اور خود مختار۔ ایسی عورت کو ہر طرح کی چھوٹ دے دی جاتی ہے مگر دوسری عورتوں کی معمولی خامی بھی معاف نہیں کی جاتی۔ کچھ عجیب حساب ہے ایسی عورت کو مرد سماج، تاریخ سب معاف کر دیتے ہیں۔ یاد کیجئے! ہیلن۔ قلوپطرہ اور وسندھرا۔ ہیلن اور قلوپطرہ کو آپ سب جانتے ہیں۔ مگر وسندھرا کا نام آپ نے نہیں سنا ہوگا۔

وسندھرا میرے شہر کی رہنے والی تھی۔

شاید بچپن میں وہ میرے ساتھ کھیلی تھی۔ مجھے کچھ ٹھیک طرح یاد بھی تو نہیں۔ اس کا گھر نان بائیوں کے بازار کے پیچھے تھا۔ وہاں ایک شوالہ تھا۔ اس کے سامنے بہت سی زمین خالی پڑی تھی۔ پھر ہمارے دور پار کے رشتہ دار کا گھر تھا۔ جو شہر کا سب سے امیر آدمی تھا۔ کبھی کبھی میں اس کے گھر جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وسندھرا بھی ہمارے ہاں کھیلنے کے لئے آجاتی تھی۔ مجھے اس کے بچپن کی صورت ٹھیک طرح یاد نہیں ہے۔ کیونکہ بچپن میں وہ ایک معمولی خوش شکل لڑکی رہی ہوگی۔ جیسی دوسری معمولی خوبصورت لڑکیاں ہوتی ہیں۔ ان

چہروں کو کون یاد رکھتا ہے ؟ پھر یہ بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ بچپن میں جو لڑکیاں بے حد حسین نظر آتی ہیں جوانی میں آکر ان کا حلیہ عجیب طریقے سے بدل جاتا ہے اور وہ پہلے کی طرح خوبصورت اور حسین معلوم نہیں ہوتیں۔ اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بچپن میں جن لڑکیوں کی شکل وصورت معمولی ہوتی ہے بڑی ہو کر بھی وہ معمولی شکل وصورت کی رہتی ہیں۔ مگر کبھی کبھار ان ہی معمولی شکل وصورت کی لڑکیوں میں کوئی ایک ایسی لڑکی بھی نکل آتی ہے جس کا حسن وشباب حدِ دل کو چھوتے چھوتے جمالِ جہاں تاب کی طرح نور پھیلانے لگتا ہے۔

وسندھرا ایک ایسی ہی لڑکی تھی۔ بچپن میں میں نے اسے بار بار دیکھا تھا۔ کئی بار اس کے ساتھ کھیلا تھا۔ کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ ایک دن وہ مجسمِ قیامت بن جائے گی کئی برس گزر گئے وہ چودہ برس کی ہو گئی۔ لوگوں نے سنا وسندھرا بہت خوبصورت نکل رہی ہے۔ پھر بھی کچھ خیال نہ آیا۔ خوبصورت لڑکیوں والے شہر میں ایک اور لڑکی کا خوبصورت نکل آنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ پھر جب اس کے حسن کے چرچے بڑھنے لگے تو اس کے باپ مدن سنگھ نے جو ایک سنار تھا، جلدی سے اس کی شادی اپنی برادری کے ایک لڑکے گوپال سنگھ سے کر دی ..... گوپال سنگھ بھی ایک زرگر تھا اور شہر کے بازار ہی میں اس کی دوکان تھی۔ وہ خود بھی شکل وصورت کا بہت اچھا تھا اور گھر کا کھاتا پیتا تھا یہ شادی بھی کوئی خاص قابلِ ذکر بات نہ تھی۔ بس شادی ہو گئی۔ کہیں کوئی ہل چل پیدا نہیں ہوئی۔ لوگ اس شادی کو دوسرے دن ہی بھول گئے۔

لیکن شادی کے بعد وسندھرا کا رنگ روپ ایسا نکھرا کہ نگری میں چاروں طرف اس کے تذکرے ہونے لگے۔ اس کے سنہرے بال، بڑی بڑی مست آنکھوں اور

پگھلے ہوئے سونے کی سی رنگت کا چرچا ہر زبان پر رہنے لگا۔ اس کے قد کی تعریف ہونے لگی۔ اس کے چال کے اس کے کپڑوں کی گن گائے جانے لگے۔ اس کے محلے کے سو سو پھیرے ہونے لگے۔ لوگ گھنٹوں وسندھرا کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے تاب رہنے لگے۔ جدھر سے وہ گزر جاتی، جس کے گھر میں وہ جاتی۔ جس راہ سے اسے گزرنا ہوتا۔ یار لوگ گھنٹوں پہلے اس جگہ کے چکر لگانے لگتے۔ شادی کے بعد چھ ماہ ہی میں اس کے حسن کا شہرہ بچے بچے کی زبان پر تھا۔

ہوتے ہوتے وسندھرا کے حسن کا شہرہ پرجا سے نکل کر دربار تک پہنچا اتفاق سے ایک اسسٹنٹ سکریٹری کا گھر وسندھرا کے ماں باپ کے گھر کے بالکل سامنے واقع تھا۔ وسندھرا کے ماں باپ کا گھر ایک منزلہ تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جب بھی وسندھرا اپنے ماں باپ کے گھر آتی اور چونکہ اس کا میکہ اور سسرال دونوں اسی شہر میں تھے اس لئے وہ دن میں دو ایک چکر تو اپنے میکے کے روز ہی لگا لیتی تھی۔ تو اس کی آمد کے ذرا دیر بعد ہی ولی عہد یعنی کنور جی شاہی گارڈ کے سواروں کے ساتھ گھوڑا دوڑاتے ہوئے اسسٹنٹ سکریٹری سے ملنے کے لئے چلے آتے۔ غرض محض ملاقات ہوتی یا کوئی ریاستی مشورہ کرنا ہوتا۔

بہرحال یہ تو ہمیں معلوم نہیں کہ اسسٹنٹ سکریٹری کے گھر میں کیا ہوتا تھا۔ ہاں رفتہ رفتہ اس اسسٹنٹ سکریٹری کا گھر دو منزلہ ہو گیا۔ اس کے گھر کا ساز و سامان بدل گیا۔ وسندھرا کے ماں باپ کے گھر کی دوسری منزل پر بھی ٹین کی چھت پڑ گئی۔ جو ہمارے شہر کی خوشحالی کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔ وسندھرا کی چال ڈھال میں ایک ٹھیراؤ اور وقار آ گیا۔

وسندھرا ایک معمولی زرگر کی بیوی تھی۔ مگر کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ پریوں کی رانی معلوم ہوتی ہے۔ ایک بار ہم لڑکوں نے اسے اپنے شہر کے قریب پہاڑی کے جنگلوں سے واپس آتے دیکھا تھا۔ جہاں وہ کنور جی کے ساتھ شکار کھیلنے گئی تھی۔ اسکے سنہرے بال اس کے شانوں پر اٹھ اٹھ کر ہوا میں لہرا رہے تھے اور اس کا مسرت سے گلنار چہرہ ڈوبتے سورج کی لالی سے دمک رہا تھا۔ وہ ولی عہد راج کمار کے ساتھ ساتھ کالے رنگ کے ایک بلیر گھوڑے پر سوار مخملیں کاٹ رائے کی برجس اور کھلے کالروں کا ریشمی بلاوز پہنے ہوئے کوئی پرستانی شہزادی معلوم ہوتی تھی۔ یہ وہ وسندھرا ہرگز نہ تھی جو بچپن میں میرے ساتھ کھیلتی تھی۔ اس کی نگاہیں آسمان پر تھیں اور اس کے گھوڑے کے سم بھی زمین سے لگے ہوئے معلوم نہیں ہوتے تھے۔

عجیب حسن و عشق کے دن تھے۔ جیسے سارا شہر اس عشقیہ داستان میں الجھا ہوا ہو۔ دن ناول کے صفحات کی طرح دلچسپ اور رومان پرور تھے۔ کوئی اور بات زبانوں پر آتی ہی نہ تھی۔

پھر سنا راج کمار جی کو یکایک مزید تعلیم کے لئے انگلینڈ بھیج دیا گیا۔ ہر ایک کا دل دھک سے رہ گیا۔ ہر شخص نے وسندھرا کے دل کے کرب اور دکھ کو محسوس کیا۔ عشق کی دردمندی اور مجبوری سے ہر شخص چور تھا۔ ہر شخص نے وسندھرا کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ ممکن ہے وہاں کوئی آنسو نہ آیا ہو۔ مگر ہم سب نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے اور ایک حسین عورت کے دلی صدمے کی تپش کو اپنے دل میں محسوس کیا۔

چند ماہ کے بعد سنا کہ وسندھرا نئے وزیر صاحب کی کوٹھی کے عالی شان باغیچے میں ٹہلتی دیکھی گئی۔ وزیر مانک چند ایک خوبرو راجپوت تھا اور شاہی خاندان کا چشم و چراغ

تھا۔ وہ حاکموں کے طائفہ سے تعلق رکھتا تھا۔ وزیر ہونے کی حیثیت سے اس کے ہاتھ میں زبردست طاقت تھی۔ خاص طور سے اس لئے کہ راجہ صاحب چند مہینہ سے بیمار تھے اور ولی عہد لندن میں تھا۔ اس لئے ریاست کی پوری طاقت کھنچ کر وزیر کے ہاتھ میں چلی آئی تھی۔

پھر دھندلی چاندنی راتوں میں وزیر صاحب کی کوٹھی کے باغ کی روشوں پر لچکے مہکتے پھولوں کی کیاریوں میں ٹہلتے ہوئے دسندھرا اور مانک چند کو لوگوں نے چھپ چھپ کر دیکھا۔ پھر وزیر اعلیٰ اور دسندھرا کی محبت کی داستانیں دہرائی جانے لگیں۔ کچھ اس انداز سے جیسے دسندھرا نے بے وفائی نہ کی ہو۔ بلکہ کوئی دوسرا علاقہ فتح کر لیا ہو۔ اس فتح کے شادیانے ہر دل میں تھے۔ سارا شہر خوشیاں منا رہا تھا۔ اب دربار دسندھرا کے میکے میں لگتا تھا۔ ریاست کے کتنے ہی فیصلے جو وزیر صاحب کو کرنے چاہیں تھے۔ دسندھرا خود کرتی تھی، حاکموں کے تبادلے، ترقیاں اور تنزلی، انعام واکرام اور کیا کیا کچھ سب اس کے اختیار میں تھا۔ سارے شہر میں دسندھرا کا غلغلہ تھا۔ میں ان دنوں میٹرک کر کے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے لاہور چلا گیا تھا اور فارمن کرسچین کالج لاہور میں فرسٹ ایر میں داخل ہو گیا تھا۔ دو سال بعد جب واپس آیا تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ وزیر مانک چند کی جگہ نائب ریذیڈنٹ بہادر نے لے لی تھی۔ شہر میں ریذیڈنسی کی ایک شاخ تھی۔ جہاں نائب ریذیڈنٹ رہتا تھا۔ تمام اہم معاملات میں وہ راجہ صاحب کو مشورے دیتا تھا اور اکثر اوقات اس کے مشوروں پر عمل ہوتا تھا۔

مگر جب ایک دن ریذیڈنٹ بہادر صاحب کا گھوڑا دسندھرا کے میکے کے گھر

(جواب تین منزلہ ہو چکا تھا) کے باہر دیکھا تھا تو حیرت اور استعجاب کی ایک لہر سارے شہر میں دوڑ گئی۔ ایسا لگا جیسے پوری برطانوی سلطنت کا سر ایک ہندوستانی لڑکی کے قدموں میں جھک گیا ہو۔ اس سے پہلے ایسا واقعہ بوڑھے سے بوڑھے بزرگوں کی یادداشت میں نہ تھا۔ یہ تو پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ ریذیڈنٹ بہادر خود چل کے شہر کے اندر کسی ہندوستانی کے گھر گئے تھے۔ ورنہ راجہ صاحب کو بھی جب ضروری مشورہ لینا ہوتا تو وہ خود ریذیڈنسی میں جاتے تھے۔

دو سال بعد جب میں گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنے شہر پہنچا تو دسندھرا کے حسن و جمال کا شہرہ ساتویں آسمان تک تھا۔ انگریز ریذیڈنٹ سے عشق کر کے دسندھرا نے گویا بین الاقوامی شہرت کی حدوں کو چھو لیا تھا۔ میں اسے دیکھنے کے لئے بہت بے تاب تھا۔ اس دوران میں میں نے مادام بواری اور بہت سے فرانسیسی ناول پڑھے تھے اور اب میں ان مشہور و معروف فرانسیسی حسیناؤں کے ناموں سے واقف ہو چکا تھا۔ جن کے آستانوں پر فرانسیسی کابینہ کے بڑے بڑے وزیر سر جھکاتے تھے۔ ہمارے شہر میں بھی ایک ایسی ہی عورت موجود تھی۔ مجھے بے پناہ اشتیاق ہوا کہ مجھے اسے دیکھنا ہی چاہئے قریب سے دیکھنا چاہئے۔ مگر پھر میں نے سوچا کہ اسے کیسے دیکھوں۔ میں نے اپنے دوست گرنجش سنگھ سے اس سے ذکر کیا۔ وہ شہر کے مضافات میں رہتا تھا اور گھر کے چاروں طرف گھنے پیڑوں والا ایک باغ تھا اور گھر کے پچھواڑے میں ایک پہاڑی نالہ شور مچاتا ہوا بہتا تھا۔ وہ شاید دسندھرا کا دور کا رشتہ دار بھی لگتا تھا۔ گرنجش سنگھ نے کچھ پس و پیش کے بعد میری بات مان لی۔ ایک روز کسی تقریب میں اس نے دسندھرا کو اور اس کے میکے والوں کو اپنے گھر کھانے پر بلایا اور اس تقریب میں مجھے بھی آنے کی دعوت

دی مجھے یاد نہیں کہ میں نے اس دعوت میں دسندھرا سے کوئی بات کی ہو۔ ایک تو میں عمر میں اس سے چار پانچ سال چھوٹا تھا۔ دوسرے ابھی بالکل کچا اور شرمیلا تھا تیسرے شاید رعبِ حسن نے زبان بند کر دی تھی۔ شاید یہ تیسرا سبب ہی واحد سبب ہو۔

کھانے کے بعد گرنجش کے باغ میں ٹہلنے کے لئے نکلے، گرمیوں کے دن تھے۔ باغ میں سفید اور زرد چنبیلی پھولی ہوئی تھی۔ پیڑوں پر خوبانیاں گدرائی ہوئی تھیں اور انار کی کلیوں سے سارا چمن یاقوت رنگ تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے دسندھرا نے خوبانی کے پیڑوں کے قریب رک کر اوپر دیکھا اور کہنے لگی۔ کیا اس پیڑ کی خوبانیاں میٹھی ہوتی ہیں۔؟

دوسرے لمحے ایک پیڑ پر گرنجش چڑھ گیا۔ دوسرے پر میں، چند منٹ کے بعد ہم دونوں نے باری باری دسندھرا کے سامنے گھاس کے ایک تختے پر سینکڑوں خوبانیاں ڈھیر کر دیں۔

تھوڑی دیر میں گرنجش کا ایک چچا جو اس کے گھر ہی میں رہتا تھا کسی اور درخت سے نیچے اترا اور دسندھرا کے سامنے خوبانیوں کا ایک بڑا ڈھیر لگا کر چھینپتا ہوا واپس چلا گیا۔ وہ لگ بھگ ساٹھ برس کا ہوگا۔ اس کے بال سفید تھے۔ جب وہ چلا گیا تو دسندھرا بڑے زور سے ہنسی۔

پھر ایک دم سے اس نے اپنی انگلی میرے گال پر رکھ دی اور بولی۔ ارے کس نے؟ بچپن میں تیرے گال پر یہاں ایک گڑھا پڑتا تھا۔ وہ کیا ہوا؟

میں اس قدر جھینپا کہ میرا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔ میں جلدی سے وہاں سے بھاگ گیا۔ ایک لفظ بھی تو اس سے نہیں کہہ سکا۔ دور تک اس کی ہنسی کے چنبیلی کے پھول میرے کانوں پر گرتے رہے۔

اس کے بعد میں نے دسندھرا سے ملنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ہاں اس کی انگلی کا لمس ابھی تک میں نے سنبھال کے رکھا ہے۔ دل کے کسی گڑھے میں، کیونکہ اب میرے گالوں میں وہ گڑھا نہیں پڑتا جو کبھی بچپن میں پڑتا تھا۔ اب میں بہت بدل گیا ہوں مگر میرے دل میں اب کئی گڑھے ہیں اور وہ انگلی شہد کی کسی قلم کی طرح اب بھی راتوں کے اندھیرے میں میرے گال کو چھوتی ہے اور شریر لہجے میں مجھ سے پوچھتی ہے کہ کہنے وہ تیرے گال کا گڑھا کہاں گیا۔؟

دسندھرا کو کسی سے شکایت نہیں تھی۔ نہ یہ کہ وہ بے وفا تھی نہ یہ کہ اس نے کئی بار محبت کی تھی۔ نہ یہ کہ اس نے بہت سی محبتوں کو ٹھکرا دیا تھا۔ نہ یہ کہ اس نے صرف اونچی جگہوں پر عشق کیا تھا۔ کسی کو اس سے شکایت نہیں تھی ہم سب اس کے شکر گزار تھے کہ وہ ہم میں پیدا ہوئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہم میں سے ہر ایک کو اس سے الگ الگ عشق ہے۔ کچھ تو اس کے عشق کی داستانیں سچی بھی تھیں۔ کچھ گڑھ لی جاتی تھیں۔ ہولے ہولے چند برس میں دسندھرا ہمارے شہر کی ایک رومانی داستان بن گئی۔

مگر نہیں ایک شخص ایسا بھی تھا جسے دسندھرا سے بہت شکایت تھی۔ وہ تھا اس کا شوہر گوپال جو خود ایک گبرو اور خوبرو نوجوان تھا۔ اس لئے اس کا گلہ جائز بھی تھا کہ وہ صرف اسی سے عشق کیوں نہیں کرتی۔ جبکہ وہ خاصا خوشحال بھی ہے۔ وہ سوچتا تھا دسندھرا بے وفا اور ہرجائی کیوں ہے۔ لوگ کیوں اس کے حسن کے گیت گاتے ہیں۔ اس کے فراق میں آہیں کیوں بھرتے ہیں؟ اسے دیکھ کر ٹھٹ کے ٹھٹ باندھ کر کیوں کھڑے ہو جاتے ہیں؟ ہولے ہولے اس کی اپنی کوئی شخصیت نہ رہی۔ وہ اب محض دسندھرا کا شوہر تھا۔ وہ دسندھرا سے شدید محبت کرتا تھا۔ مگر اس کے دل میں ہر وقت ایک لڑائی سی چلتی رہتی مگر کبھی کبھی گوپال کو اتنا غصہ آتا کہ اس کا دل

وسندھرا کو پیٹنے کے لئے چاہنے لگتا۔ لیکن پھر وسندھرا کو دیکھتے ہی اس کا دل پگھل جاتا اور وہ اسے مارنے کے بجائے اس کے قدموں میں جھک جاتا۔ مگر وسندھرا کے قدموں میں جھکے ہوئے بھی دنیا والوں کے لئے اس کا غصہ بڑھ جاتا۔ وہ ساری ذمہ داری باہر کی دنیا پر ڈال دیتا جو وسندھرا کے عجیب وغریب حسن سے متاثر ہو کر اس جوڑے کی شادی شدہ زندگی پر اثر انداز ہوتی تھی اور ان دونوں کو باہمی محبت، رفاقت اور پاک بازی سے نہیں رہنے دیتی تھی۔

جب اس طرح وسندھرا کے تین چار معاملے ہو گئے اور جب ریذیڈنٹ بہادر والا رومان زور پکڑنے لگا تو گوپال نے شہر چھوڑنے کی ٹھان لی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ اپنی حسین بیوی کو لے کر کہیں دور چلا جائے گا۔ جہاں اس شہر کے حسن وعشق کے چرچے کی پرچھائیں بھی ان تک نہ پھٹکے۔ وسندھرا پہلے تو شہر چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوئی لیکن جب گوپال نے خود اسے چھوڑنے کی دھمکی دی تو وہ شوہر کے ساتھ کہیں دور جانے پر آمادہ ہو گئی۔ چپکے چپکے گوپال نے جانے کی تیاری کر لی۔ وسندھرا کو بھی اس نے خبردار کر دیا تھا کہ اس بات سے کسی کو آگاہ نہ کرے۔

مگر نہ جانے کس طرح یہ خبر آپ ہی آپ سارے شہر میں پھیل گئی۔ جگہ جگہ ناکوں پر اور نکڑوں پر، بازاروں میں، گلی کوچوں میں اور دفتروں میں یہ ذکر ہونے لگا کہ گوپال وسندھرا کو لیکر جا رہا ہے۔ ہمیشہ کے لئے شہر چھوڑ رہا ہے اور کون اسے منع کر سکتا ہے۔ گوپال وسندھرا کا شوہر ہے۔ وسندھرا اپنے شوہر کے ساتھ جا رہی ہے۔

سارے شہر میں جیسے بجلی سی گری۔ سب دم بخود تھے مگر منہ سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں بات چیت کرتے تھے۔ سب کے چہرے سہمے ہوئے

تھے جیسے شہر پر کوئی بہت بڑی آفت آنے والی ہو۔

جانے کا دن آ گیا۔ گوپال نے صبح سویرے سارا سامان چھ خچروں پر لدوا کر انہیں انگالی صاحب کے گوردوارے کی طرف سے پہلے سے روانہ کر دیا۔ طے یہ ہوا کہ جانے سے پہلے گوپال اور وسندھرا انگالی صاحب کے گوردوارے میں حاضر ہو کر اپنے اپنے گناہوں کی توبہ کریں گے اور پھر ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لئے رجوری چلے جائیں گے۔

انگالی صاحب کا گوردوارہ شہر سے چار میل دور ایک پرفضا پہاڑی مقام پر تھا۔ راستہ دشوار گزار تھا۔ ایک جگہ ایک خطرناک نالہ پر ایک لکڑی کا پل آتا تھا۔ اسے پار کرنے کے بعد ایک خطرناک اترائی اتر کر شہر کے باہر دریا کے ایک حصہ کو پیدل چل کر عبور کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ وہاں دریا کا پاٹ بہت چوڑا تھا اور پل کوئی نہ تھا۔ اسی لئے گوپال نے سامان والے خچروں کو صبح سویرے انگالی صاحب کی طرف روانہ کر دیا اور خچر والوں سے کہہ دیا کہ وہ شہر سے دو میل باہر کوٹھانی کے لکڑی کے پل کے قریب اس کا انتظار کریں۔ دو گھوڑے اس نے اپنے اور وسندھرا کے لئے رکھ لئے۔ پھر وسندھرا کو لیکر اس کے میکے والوں سے رخصت ہونے کے لئے چلا گیا اور اس کے بعد دونوں نے شہر سے باہر کا رخ کیا۔

وسندھرا اور گوپال دونوں اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار اپنے اپنے خیالوں میں گرفتار شہر کی حدود سے باہر نکل گئے اور ڈونگس کے چشمے سے آگے جانے والے راستے پر پہنچ گئے۔ اب شہر کی عمارتیں ختم ہو چکی تھیں اور دھان اور مکا کے کھیت شروع ہو گئے تھے کہیں کہیں راستے میں اکا دکا کچے مکان اٹھاؤ چولہا، چائے خانے دکھائی دیتے اور ہر طرف سناٹا تھا۔ وسندھرا سر جھکائے گھوڑے کی باگ ڈھیلی رکھے کچھ سوچتی چلی جا رہی تھی۔ اسے آج اپنا شہر چھوڑتے ہوئے کتنا عجیب معلوم ہو رہا تھا لیکن وہ کیا کر سکتی تھی؟

جانا تو تھا ہی۔

شہر ان سے بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ مکا کے کھیت، دکانیں، کچے مکان بھی پیچھے رہ گئے۔ اب پہاڑی راستہ تھا۔ ایک کچی پگڈنڈی سی پہاڑ کے سینے پر رینگتی ہوئی اوپر جا رہی تھی۔ اس پہاڑ کے دوسری طرف ٹھانی کا خطرناک نالہ تھا۔ جسے عبور کر کے انہیں انگالی صاحب کی طرف بڑھنا تھا اور پھر انگالی صاحب کے قدموں میں سیس نو کے نئی زندگی کی طرف روانہ ہونا تھا۔

اب دور دور کوئی آبادی نہ تھی۔ سنسان راستے، ویران جنگل کہیں کہیں ڈھکیوں کے نیچے پہاڑی گڈریوں کے خاموش گلے ڈھلوانوں پر چڑھتے ہوئے وسندھرا کے دل سے ایک آہ نکلی اور وہ دونوں پہاڑی اونچائی کا موڑ کاٹ کر پہاڑ کے دوسری طرف چلے گئے جہاں کوٹھانی نالے پر لکڑی کا ایک پل تھا۔ پہاڑ کے دوسری طرف جا کے یکایک انہیں لوگوں کی ایک بھیڑ دکھائی دی۔ بہت لوگ تھے۔ پانچ سو کے قریب ہوں گے۔ نہیں ہزار سے اوپر ہوں گے۔ نہیں دو ہزار کے لگ بھگ ہوں گے۔ نہیں تین ہزار سے بھی اوپر ہوں گے یہ اس کے اپنے شہر کے لوگ تھے اور اتنی بڑی تعداد میں راستے میں کھڑے تھے کہ ان کی اوٹ میں لکڑی کا پل چھپ گیا تھا۔

وہ دونوں جب ان لوگوں کے قریب پہنچے تو کسی نے ان سے کچھ نہیں کہا۔ بھیڑ نے چھٹ کر انہیں راستہ دے دیا۔ ایک نے وسندھرا کے گھوڑے کی باگ تھام لی کسی دوسرے نے گوپال کے گھوڑے کی باگ تھام لی اور آہستہ آہستہ کچھ کہے بغیر وہ لوگ ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ گوپال نے حیرت سے پوچھا۔ آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔؟

"انگالی صاحب" ایک شہری نے جواب دیا اور گوپال کے گھوڑے کے ساتھ

ساتھ چلنے لگا۔

گوپال حیرت میں تھا کہ یہ ماجرا ہے مگر کوئی اس سے بات نہ کرتا تھا۔ وہ سب لوگ ایک قافلہ کی صورت میں خاموشی سے ان کے ساتھ چل رہے تھے۔ بہت جلد سب لوگ کوٹھانی کے لکڑی کے پل کے قریب پہنچ گئے جو ایک گہرے نالے کے کھڈ کے اوپر واقع تھا، مگر یہ دیکھ کر گوپال کے منہ سے چیخ نکل گئی کہ نالے کا پل کھڈ کے اوپر واقع نہیں تھا۔ بلکہ کھڈ کے اندر گرا ہوا تھا اور پانی اس کے اوپر بہہ رہا تھا۔

"پل ٹوٹ گیا" ایک صاحب بڑی سنجیدگی سے بولے۔

"چچ چچ۔ دوسرے صاحب نے گوپال کو بتایا۔ دیکھئے پل ٹوٹ گیا ہے۔

پھر تیسرے صاحب جو دسندھرا کے گھوڑے کی باگ تھامے ہوئے تھے افسوس سے سر ہلا کر بولے "اب ہم لوگ انگالی صاحب کیسے جائیں گے۔ پل تو ٹوٹ گیا ہے۔

گوپال دل ہی دل میں غصہ سے پیچ تاب کھا رہا تھا۔ ان کم بختوں نے خود ہی پل توڑ ڈالا ہے اور مجھے کس معصومیت سے بتا رہے ہیں کہ پل ٹوٹ گیا ہے۔ یہ خود ہمارا راستہ روک رہے ہیں اور اپنی دانست میں مجھے بتا رہے ہیں کہ وہ تو کسی طرح کی دلچسپی ہمارے جانے نہ جانے سے نہیں رکھتے۔ مگر یہ سب لوگ یہاں آ کیسے گئے۔ گوپال حیران تھا۔ ان لوگوں میں صرف نوجوان ہی نہیں تھے، بوڑھے اور ادھیڑ عمر کے لوگ بھی تھے، ہندو بھی تھے مسلمان بھی تھے۔ سکھ بھی تھے عیسائی بھی۔ ان میں راجپوت بھی تھے اور پنڈت بھی، رنگین مزاج بھی تھے اور زاہد خشک بھی..... ایسے لوگ بھی تھے۔ جن کے چال چلن پر آج تک کسی نے انگلی نہ رکھی تھی۔ اور ایسے بھی تھے جنہوں نے زندگی میں شاید کوئی عیب نہ چھوڑا تھا۔ ان میں دوکاندار بھی تھے اور چھوٹے موٹے حاکم بھی۔ باغات کے مالی بھی تھے۔

اور گڈریئے بھی اور وہ لوگ بھی تھے جن کی صورت تک سے وہ آشنا نہیں تھا۔ وہ سب اسے روکنے کے لئے آگئے تھے اس کے دل میں ایک عجیب سی جنگ ہونے لگی۔ اتنے لوگوں کے آنے کی اسے خوشی بھی تھی اور غصہ بھی تھا۔ دونوں جذبے ایک دوسرے سے گتھے ہوئے تھے۔

مگر میں تو جاؤں گا۔ اس نے بالآخر دانت پیس کر کہا۔

مگر جاؤ گے کیسے؟ پل تو ہے نہیں اور کھڈ گہرا ہے اور اس کھڈ پر پل بنانے کے لئے کم از کم دو ماہ درکار ہوں گے۔

ہاں! ٹھیک ہے دو ماہ بعد چلے جانا۔ دوسرے صاحب بولے۔

ایک بوڑھے خوجے قاسم جی نے کہا۔ میری بیٹی کی شادی اگلے ماہ میں ہوگی۔ اس کے زیور کون تیار کرے گا۔

اور میری بہن کہتی ہے میں تو گوپال کے ہاتھ کی بنائی ہنسلی پہنوں گی اپنی شادی میں اور تم چلے جا رہے ہو۔

یہ سولہ تولے سونا ہے۔ میری بیوی کے لئے دو گوکھرو بنا دو۔ جیسے تم نے ٹھاکر دیال سنگھ کی چچی کے لئے تیار کئے ہیں۔ بالکل اسی ڈیزائن کے بنتے چاہئیں۔

گوپال! تم ہمارے شہر کے سب سے اچھے سنار ہو۔ یہ کام تمہیں اپنی بھابی کی خاطر کرنا ہی ہوگا۔ ٹھاکر جگ جیت سنگھ کپڑے کی ایک چھوٹی سی پوٹلی میں بندھا ہوا سونا گوپال کے ہاتھوں میں دینے کی کوشش کرنے لگا۔

یکایک اسے چاروں طرف سے لوگوں نے گھیر لیا۔ کوئی سونا لایا تھا کوئی چاندی امیر اور غریب سب مل کر اس پر کام کی یلغار کر رہے تھے۔ وہ اسے جانے سے نہیں روک

رہے تھے مگر وہ اسے اتنا کام دے رہے تھے کہ وہ اگلے دو ماہ تو کیا اگلے دو سال میں بھی اس کام کو پورا نہیں کر سکتا تھا۔

جو کچھ انہوں نے اس سے کہا تھا اتنا ضروری نہیں جتنا ضروری وہ تھا جو انہوں نے اس سے نہیں کہا تھا اور جو کچھ انہوں نے اس سے نہیں تھا۔ اس نے اس کے دل کو پکڑ لیا تھا اور اس کے حلق کو گرفت میں لے لیا تھا۔ اسے اپنا گلا بند ہوتا ہوا معلوم ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔ وہ اسے سونے چاندی کی رشوت نہیں دے رہے تھے، وہ اسے پیار کی رشوت دے رہے تھے وہ خاموش زبان سے کہہ رہے تھے، ہم تمہیں جانے نہ دیں گے کسی طرح جانے نہ دیں گے۔ وسندھرا کی حسین آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس نے اپنا چاند سا مکھڑا دوپٹے میں چھپا لیا۔

اچھا اب میں کبھی یہ شہر چھوڑ کر نہ جاؤں گا۔ گوپال نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

یکایک نوجوان اچھلنے لگے اور ڈھول بجنے لگے اور سب مل کر پہاڑی گیت گانے لگے گھوڑوں کی باگیں واپس پھیر دی گئیں۔

یوں تو میں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے جلوس اور جشن دیکھے ہیں مگر اس چمکیلے دن والے چھوٹے سے پہاڑی قافلے کو میں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ جب ایک چھوٹے سے شہر کے لوگ اپنے شہر کی خوبصورتی کو واپس لے آئے تھے۔

شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

---

# دُرگت

میں آسانی سے کسی دوست کی مصیبت میں پھنسنے والا آدمی نہیں ہوں۔ لیکن ایک دفعہ یہ ہوا کہ میرے دوست موتی رام نے مجھے چائے پر مدعو کر رکھا تھا اور چونکہ اسی روز شام کو کچھ مہمانوں نے میرے یہاں آنے کی دھمکی دی تھی۔ اس لئے میں نے موتی رام کی چائے کی دعوت جھٹ سے منظور کر لی۔ اور اس کے گھر چائے پینے کے لئے چلا گیا۔ وہاں جا کر ایک عجیب ماجرا دیکھا۔ مسٹر اور مسز رام دونوں باہر جانے کے لئے کپڑے پہنے ہوئے عجیب گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں کھڑے تھے اور ان کے چھ بچے ان کے آس پاس حیرت سے دم بخود ان کی طرف دیکھ رہے تھے اور چائے کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں تھا۔

"کیا بات ہے موتی رام؟" میں نے پوچھا۔

"کیا بتاؤں دوست؟" موتی رام بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ میرے ایک قریبی رشتہ دار کا انتقال ہو گیا ہے۔ بے چارہ کولابے میں رہتا تھا جو یہاں سے پندرہ میل دور ہے!

میں نے کہا: "اب کولابے میں رہنے والوں نے ہمیشہ زندہ رہنے کا پٹہ لکھوا نہیں

رکھا۔ موت وہاں بھی آسکتی ہے اور یہاں سے بیس میل دور بھی۔ ہا رشتہ دار کے مرنے کا افسوس تو وہ برحق ہے۔ رشتے دار مرتے ہی رہتے ہیں اور ان کی جگہ نئے رشتہ دار پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اب شہر بمبئی کو ہی لے لو۔ سنا ہے یہاں ہر روز بیس ہزار آدمی مرتے ہیں۔ اور ان کی جگہ لینے کے لئے پچیس ہزار آدمی ہر روز ریل گاڑیوں میں بھر کر باہر سے آجاتے ہیں سمجھ میں نہیں آتا کس کے آنے کا ماتم کیا جائے کس کے جانے کا افسوس۔

"افسوس اس بات کا نہیں ہے، مسز موتی رام آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں، کہ ان کا رشتہ دار مر گیا ہے افسوس اس بات ہے کہ میں اپنے ہاتھ سے آپ کو چائے نہیں پلا سکوں گی۔"

"کوئی بات نہیں بھابی جی۔ میں نے مسز موتی رام کے گلے میں پڑے ہوئے سونے کے گلوبند کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں کل آجاؤں گا۔ چائے پینے کے لئے۔

اتنا کہہ کر میں کرسی سے اٹھ بیٹھا۔ فوراً موتی رام نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے روکا۔ وہ میری طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھ کر بولا۔

"دوست میں اس وقت ایک عجیب مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ چھ بچوں کا ساتھ ہے، ساتواں پنگوڑے میں سویا پڑا ہے اور پرسے میں اپنے ساتھ میں چھ بچوں کو نہیں لے جا سکتا۔ اور پرسے میں جانا بھی ضروری ہے۔ تم اس وقت میری مدد کرو۔ دو تین گھنٹے ہماری خاطر اس گھر میں ٹھہر کر ہمارے بچوں کی دیکھ بھال کرو تو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی اس وقت پانچ بجے ہیں۔ ہم آٹھ بجے تک ضرور آجائیں گے۔"

مسز موتی رام نے مجھے سوچنے کا موقع نہیں دیا۔ جلدی سے بولیں۔ چائے تم خود بنا کے پی لینا۔ کچن میں سب کچھ رکھا ہے۔ فرج میں انڈے بھی ہیں۔ کچھ کھانے کا سامان

بھی، مٹھائی بھی ہے۔

میں نے سوچا، آٹھ بجے تک تو میرے مہمان بھی میرے گھر پر میرا انتظار ضرور ہی کریں گے چلو اُدھر چائے کی بچت ہوگی، اِدھر مفت میں چائے مٹھائی، فروٹ سے اپنی تواضع رہے گی۔ تین گھنٹے یہاں آرام سے گزار لیں گے۔ اس میں مصیبت ہی کیا ہے پیارے! کبھی کسی دوست کے کام بھی آنا چاہیئے۔

چنانچہ میں نے ہاں کردی اور وہ لوگ میرا شکریہ ادا کرکے اپنا گھر اور اپنے بچے میرے سپرد کرکے جلدی سے رخصت ہوگئے۔

ان کے جانے کے فوراً بعد میں نے گھر کی سب سے بڑی لڑکی پشی سے کہا جس کی عمر دس سال کی تھی۔

" پشی چائے تو پلاؤ۔

" ابھی لاتی ہوں انکل، وہ مستعدی سے بولی اور دوڑی دوڑی کچن میں گئی۔ دوڑی دوڑی واپس آئی اور کہنے لگی نعمت خانے میں تو تالا پڑا ہے معلوم ہوتا ہے جاتے سمے ممی غلطی سے تالا لگا گئیں۔ نعمت خانے میں ہی چائے دودھ سب بند ہے!"

" تو فرج میں دیکھو۔

" فرج بھی بند کرگئی ہیں۔

بڑا لڑکا بنٹو جس کی اصلی عمر آٹھ سال ہے اور جو بارہ سال کا معلوم ہوتا ہے اور بڑے تندرست ہاتھ پاؤں کا ہے۔ بڑے زور سے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا! "یہ تو ممی کی پرانی عادت ہے۔ باہر جاتے سمے ہمیشہ نعمت خانہ بند کرجاتی ہیں مگر آپ فکر نہ کریں انکل۔ آپ کو چائے ضرور پلوائی جائے گی۔ آپ آرام سے اس صوفے پر بیٹھیں۔ کوٹ

اتار کر مجھے دے دیجئے میں اسے اندر کی الماری میں ٹانگے دیتا ہوں۔ پنکھا کھولے دیتا ہوں گرمی کا موسم ہے ٹائی کھول کر آرام سے بیٹھئے۔ ابھی چائے تیار ہوئی جاتی ہے۔

میں نے ٹائی ڈھیلی کی، کوٹ اتار کر بنٹو کو دے دیا جوتے اتار کر پپّو کو دیئے چھڑی ٹلو کے ہاتھ میں تھما دی۔ ٹوپی بلو کے حوالے کی اور خود چار سال کی مینا کو گود میں لے کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں بنٹو چائے کا سامان بازار سے لایا۔ پشی نے چائے بنائی اور سلیقے سے مجھے پیش کی چائے مٹھائی، کیک، سموسے اور نمک پارے سب ہی کچھ تھا۔ ایک بات ہے۔ موتی رام کے بچے بڑے ہونہار اور سلیقے والے تھے۔ بہت جی خوش ہوا۔

چائے کے بعد کچھ وقت آرام سے گزارا۔ پھر مینا نے میری گود میں بیٹھے بیٹھے مجھ سے ایک کہانی سنی۔ بنٹو نے حساب کے چند سوال مجھ سے حل کرائے۔ اتنے میں اندر کے کمرے سے منے کے رونے کی آواز آئی۔ غالباً منا پنگوڑے میں پڑا سو رہا تھا اور ابھی صرف ایک سال کا تھا جاگ گیا تھا۔ پشی اسے وہاں سے لے آئی اور خود کچن میں منے کے لئے دودھ گرم کرنے لگی۔ منا رونے لگا تو بلو نے اسے جلدی سے میرے ہیٹ پر بٹھا دیا اور بولا۔ دیکھئے انکل منا آپ کے ہیٹ میں بیٹھا ہوا کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ سب بچے منے کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ منا بھی انہیں دیکھ کر ہنسنے لگا۔ اسے وہ ہیٹ جس میں وہ بیٹھا ہوا تھا بہت پسند آیا۔ تھوڑی دیر تک وہ اس کے کونے پکڑ کر کھیلتا رہا۔ پھر وہ اسے کموڈ کی طرح استعمال کرنے لگا۔ پشی دوڑی دوڑی آئی اور منے کو ہیٹ سمیت اٹھا کر غسل خانے میں لے گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ساتھ کے کمرے سے بلو اور پپّو کے لڑنے کی آواز آئی میں بھاگ کر گیا کہ دیکھوں ماجرا کیا ہے؟ دیکھا تو دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ بلو پپّو سے کہہ رہا تھا "نکال چونی! نکال چونی! نہیں تو گلا گھونٹ دونگا۔"

میں نے بڑی مشکل سے دونوں کو الگ کیا اور ببلو سے پوچھا۔ کاہے کی چونی بیٹا؟ کاہے کی چونی مانگ رہا ہے؟

ببلو روتے ہوئے بولا۔ "پپّو نے مجھ سے شرط لگائی تھی کہ یہ انکل کا بوٹ ہے۔ اس کا سینڈل نہیں بن سکتا۔ میں نے کہا بن سکتا ہے۔ وہ بولا بن سکتا ہے تو بنا کر دکھا میں تجھے چونی دوں گا۔ میں نے بنا کے دکھا دیا۔ اب وہ چونی نہیں دیتا۔ تم ہی دیکھو انکل سینڈل بنا ہے کہ نہیں؟ اس نے مجھے میرا بوٹ دکھایا میں نے گھبرا کر دیکھا۔ ببلو نے غالباً کسی بلیڈ یا قینچی سے میرے جوتے کی نوک کو کاٹ دیا تھا۔ ایڑی کے اوپر کا چمڑا بھی تراش ڈالا تھا۔ بے چارے نے بڑی محنت سے میرے بوٹ کا سینڈل بنایا تھا اور اس پر پپّو کی نالائقی دیکھئے کہ اسے چونی تک نہیں دے رہا تھا۔

خون میری رگوں میں جمنے لگا تھا۔ خوف اور غصہ سے میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے تھے کہ اتنے میں پشی مسکراتی ہوئی میرے پاس آئی انکل میں نے آپ کا ہیٹ دھو کر پریس کر دیا تھا۔ اتنا کہہ کر اس نے کوئی چیز میرے ہاتھ میں رکھ دی۔ یہ میرا فلیٹ ہیٹ تھا جو اب گاندھی کیپ بن چکا تھا۔ میں اس کی تہیں کھول کر اسے غور سے دیکھنے ہی والا تھا کہ ایک زور کی چیخ مار کر ٹلو نے میرے ہاتھ سے ہیٹ چھین لیا اور اسے میری چھڑی کی نوک پر رکھ کر گھمانے لگا۔ سب بچے خوشی سے غالباً ہنسنے لگے۔ مینا خوشی سے قہقہے لگاتے ہوئے بولی۔ "سرکس کا جادوگر۔! اتنے میں ببلو میاں میرا کوٹ لے کر میرے پاس آئے۔ سرکس کا کھیل ہوگا اب۔!

"ٹھیک ہے سرکس ہی سہی۔۔۔۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔

"آپ جوکر ہیں۔!

"بلاشبہ میں جوکر ہوں۔

مینا میری گود میں بیٹھے بیٹھے تالی بجا کر بولی۔ آہا انکل جوکر! انکل جوکر! بنٹو بولا۔

اب جوکر بننا ہے تو ٹھیک طرح میک اپ کر دو انکل۔!

"کس طرح کروں میک اپ؟ میں نے لرز کر پوچھا۔

ٹلو بولا: "میں انکل کو جوکر بناتا ہوں۔

ٹلو گھر کے اندر کے کسی کونے سے ایک پرانا غبارہ لایا۔ اس کا ایک حصہ پھلا کر اس کو میری ناک کی نوک سے باندھ دیا۔ ببلو نے اپنے پینٹ بوکس سے لال رنگ کی روشنائی نکال کر میرے رخسار لال کیے۔ بنٹو نے میرے ہونٹ کالے کیے۔ میری ٹوپی کے اوپر کے کونے پر اس نے گوند لگا دیا۔ اب میں جوکر تھا اور بچے میرے چاروں طرف خوشی سے ناچ کود رہے تھے۔ بنٹو نے میری ٹانگوں کے درمیان میری چھڑی رکھ دی اور سب بچے ایک دم ہلا بول کر اس پر سوار ہو گئے۔ چھڑی چرچرا کر ٹوٹ گئی اور میں بچوں سمیت فرش پر گر پڑا۔ ابھی گھٹنوں کے بل اٹھا بھی نہ تھا کہ منی نے تالی بجائی۔ گھوڑا گھوڑا اور اچک کر مجھ پر سوار ہو گئی۔ اس کے سوار ہونے کی دیر تھی کہ ٹلو نے بھی ایک چھلانگ لگائی اور میری گردن پر آ رہا۔ پھر بنٹو اور ببلو بھی ایک دیوار سے جست لگا کر میری پیٹ پر سوار ہو گئے۔ اتنے زور کا حملہ تھا کہ گھوڑا بیچ میں پچک گیا اور فرش پر گر پڑا۔ پھر دو تین گھونسے دھکے مکے لگے وہ چیخم دھاڑ مچی کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب بچے الگ ہوئے تو میں نے اپنا جائزہ لیا۔ چہرہ بھوتوں کا سا تھا۔ بال بچے کھسٹے قمیض اور پتلون تار تار، کوٹ دھجیاں دھجیاں۔ چہرے پر ان گنت خراشیں باقی بدن کا کیا حال تھا یہ تو ایکسرے کے بعد ہی پتہ چلے گا۔

گھڑی کا فیتہ الگ ہو کر ایک طرف کو لٹک گیا تھا۔ میں نے اسے دوبارہ کلائی پر باندھنے کی کوشش کرتے ہوئے وقت دیکھا۔ ساڑھے نو بج چکے تھے اور ابھی تک وہ لوگ نہیں آئے تھے حالانکہ آٹھ بجے تک آنے کو کہہ گئے تھے۔ بہر حال اب میں زیادہ دیر نہیں رک سکتا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ ایک پاؤں میں بوٹ، دوسرے میں سینڈل اور ہاتھ میں ٹوٹی ہوئی چھڑی لے کر اٹھنے ہی والا تھا کہ دروازے پر گھنٹی بجی۔ پشی نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔ مسٹر اور مسز موتی رام تھے۔ آتے ہی مجھے دیکھ کر خوشی سے کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

"تو آپ بھی بچوں میں بچے بن گئے! واہ کیا جوکروں کی سی صورت بنا رکھی ہے آپ نے مسز موتی رام چہکیں۔

غصہ تو مجھے بہت آ رہا تھا مگر کسی طرح پی گیا۔ اپنی کپکپاتی ہوئی آواز کو دباتے ہوئے دھیرے سے بولے۔ "آپ لوگ پرسہ دے آئے۔؟

"نہیں بھائی صاحب مسز موتی رام بولیں۔ جن کے ہاں ہم لوگ پرسہ دینے گئے تھے وہ لوگ کو ملے نہیں۔ اس لئے ہم لوگ پکچر دیکھنے چلے گئے۔

"پکچر دیکھنے چلے گئے! میں نے دل ہی دل میں دانت پیس کر کہا۔ اور یہاں یہ گت بن گئی۔ میں نے جلدی سے اجازت چاہی تو بنٹو میرے قریب آ کر بولا۔ "انکل یہ لیجئے سات آنے۔

"سات آنے! کاہے کے سات آنے بیٹا۔

"چائے کا سامان نہیں آیا تھا؟ بنٹو بولا۔ ممی نعمت خانہ بند کر گئی تھیں۔ میں آپ کے کوٹ کی جیب سے دس روپے نکال کر لے گیا تھا اس میں سے سات آنے بچے ہیں۔ یہ لیجئے!"

مسز موتی رام خوش ہو کر بولیں، میرا بیٹا بنٹو حساب کا بڑا کھرا ہے کبھی ایک پائی ادھر سے ادھر نہیں کرتا۔ لے لیجئے نا! آپ ہی کے پیسے ہیں!"

میں غصہ سے تھر تھر کانپنے لگا۔ میرا خون اب کھولنے لگا تھا اس وقت اگر میں ایک آتش فشاں پہاڑ ہوتا تو فوراً پھٹ پڑتا، مگر میں تو ایک مجبور انسان تھا۔ میں نے سر جھکا لیا اور کچھ کہے بغیر فوراً ان کے گھر سے نکل آیا۔

اس دن سے میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ آئندہ کبھی دوست کی مصیبت کے وقت مدد نہیں کروں گا مگر سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟ جب تک اس دنیا میں ہم ہوں گے اور دوست بھی ہوں گے تو مصیبتیں تو آتی ہی رہیں گی اور ہماری آپ کی طرح کے لوگ اس میں پھنستے ہی رہیں گے۔

---

# چوراہے کا کنواں

میرا بچہ بیمار تھا میرا خیال تھا کہ وہ مر رہا ہے۔ لوگوں نے کہا۔ اگر تم اسے چوراہے کے کنویں پر لے جاؤ اور اس کنویں کا ایک گھونٹ پانی اس کے حلق میں اتار دو تو تمہارا بیٹا بچ جائے گا۔

میں نے پوچھا "چوراہے کا کنواں کہاں ہے۔؟

وہ بولے "کہیں نہیں، گاؤں میں ہے۔

کہیں نہیں، گاؤں کہاں ہے۔؟ میں نے پوچھا۔

ہمارے گاؤں کے سب سے بڈھے وئید نے کہا۔

"تم یہاں سے وہاں جاؤ۔ وہاں سے جہاں جاؤ۔ جہاں سے تہاں جاؤ اور جب تم تہاں پہنچو گے تو وہاں سے کہاں کو مڑ جانا۔ بالکل سامنے تمہیں کہیں نہیں گاؤں ملے گا۔ اس کے وسط میں چوراہے کا کنواں ہے۔

میں نے وئید کا شکریہ ادا کیا۔ بچے کو اپنی گود میں اٹھا لیا اور اپنے گاؤں سے باہر

نکل کھڑا ہوا۔

میں یہاں سے وہاں گیا۔ وہاں سے جہاں گیا۔ جہاں سے تہاں گیا اور تہاں پہنچ کر جب میں کہاں کو مڑا تو مجھے اپنے سامنے چار سڑکیں نظر آئیں۔

ایک لال سڑک تھی۔

ایک نیلی سڑک تھی۔

ایک کالی سڑک تھی۔

ایک سفید سڑک تھی۔

اور ان چاروں سڑکوں کو کاٹتے ہوئے دائرے کی شکل میں کہیں نہیں گاؤں آباد تھا اور اس کے وسط میں چوراہے کا کنواں تھا۔

چوراہے کے کنواں پر بہت سارے لوگ جمع تھے۔ مرد اور عورتیں، بڈھے اور بچے ایک میلہ سا لگا تھا اور ان لوگوں میں ایک دراز قد، سپید ریش بڈھا اِدھر اُدھر گھومتا ہوا اور پر وقار معلوم ہوتا تھا۔ ہر شخص اس کو تعظیم دے رہا تھا اور بے حد وجیہ بڈھا تعظیم لیتے ہوئے بڑے شاعرانہ انداز میں اپنی بانہوں کو اوپر نیچے گھماتا تھا۔ ایسی شاعری جو صرف پھلدار شاخوں میں ہوتی ہے۔

بڈھے نے مجھ سے پوچھا۔ "تم اس گاؤں میں اجنبی ہو۔؟

میں نے تعظیماً سر جھکا دیا۔

بڈھے نے پوچھا۔ "تم کہاں سے آئے ہو۔؟

میں یہیں کہیں، گاؤں سے آیا ہوں۔ میرا بچہ بیمار ہے اور وید جی نے کہا ہے۔ اگر میں اپنے بچے کو چوراہے کے کنویں کا پانی ایک گھونٹ پلا دوں تو میرا بچہ بچ جائے گا۔

"پانی سے کیا ہوگا۔؟ بڈھے نے بڑے مایوس لہجہ میں پوچھا۔

پانی میں بڑی طاقت ہے بابا؛

آگ میں بڑی طاقت ہے بیٹے۔

"آگ اور پانی دو ہی بڑی طاقتیں ہیں بابا۔ آگ جو انسان کے دل کے اندر ہے پانی جو اس کی آنکھ میں ہے۔ جس کام کو آگ پورا نہیں کر سکتی اسے پانی پورا کر دیتا ہے ایسا وید جی نے کہا تھا۔

بڈھا میری بات سن کر مسکرایا۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ تمہارے گاؤں کا وید بڑا سمجھدار معلوم ہوتا ہے۔ مگر افسوس! اس وقت تمہیں اس کنویں سے ایک بوند پانی نہیں مل سکتا۔

"کیوں۔؟

"دیکھتے نہیں ہو۔؟ ہم کنواں صاف کر رہے ہیں۔

یکایک عین اسی وقت ایک غوطہ خور نے باہر نکل کر جال کو کنویں کے باہر الٹ دیا۔ جال سے بہت سا کیچڑ زمین پر بکھر گیا۔ ایک دم بہت سے لوگ دوڑے اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کیچڑ میں کچھ ٹٹولنے لگے مگر انہیں کیچڑ میں سے کچھ نہ ملا۔ غوطہ خور نے خالی جال کو ہاتھ میں لے کر پھر کنویں میں چھلانگ لگا دی۔

"یہ غوطہ خور کیا ڈھونڈ رہا ہے۔؟ میں نے بڈھے سے پوچھا۔

"کچھ ڈھونڈ نہیں رہا ہے۔ بڈھے نے جواب دیا۔

یہ کنویں کا گندہ کیچڑ نکال کے باہر پھینک رہا ہے۔ جب سارا کیچڑ باہر نکال آئے گا۔ تو یہ کنواں صاف ہو جائے گا۔ پھر تم اس کا پانی اپنے بچے کو پلا سکتے ہو۔"

میں بچے کو لئے ہوئے کنارے پر کھڑا ہو گیا۔ غوطہ خور جال کو لئے ہوئے باہر نکلا۔ اس نے کیچڑ نیچے زمین پر بکھیر دیا۔ کیچڑ میں سے ایک کنگھی نکلی۔

غوطہ خور نے پوچھا "یہ کنگھی کس کی ہے۔؟

ایک نو بیاہتا لڑکی نے شرما کر غوطہ خور کے ہاتھ سے کنگھی لے لی اور پھر اپنے شوہر کے کندھے پر جھک گئی۔ اس لڑکی کے بال سنہرے لمبے تھے۔ چہرہ بیضوی اور گیہواں آنکھیں بڑی بڑی اور بھوری۔ کبھی کبھی جب ان میں آنسو آجاتے تو وہ شفق کی طرح چمک اٹھتی تھیں۔

"یاد ہے۔؟ وہ اپنے شوہر سے آہستہ سے بولی اور اس کی انگلیاں دھیرے دھیرے کنگھی پر پھرنے لگیں۔ جیسے کنگھی کا ہر دانہ وقت کا ایک شیریں لمحہ ہو جو اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔

"یاد ہے! اس کے جوان شوہر نے آہستہ سے کہا اور وہ خوابوں میں کھو گیا۔

اسی کنوئیں کے کنارے اس نے اپنی شرمیلی کو پہلی بار دیکھا تھا۔ جب وہ غسل کرنے سے پہلے اپنے سنہرے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ وہ پیاسا تھا اور اس نے اپنا گھوڑا اس کنوئیں پر روک کر اس سے پانی مانگا تھا۔

پانی!

پانی میں بڑی طاقت ہے!

پانی میں بڑی محبت ہے!

جوان شوہر نے اپنی نو بیاہتا بیوی سے کنگھی لے کر اسے ہونٹوں سے لگایا پھر اسے اپنی جیب میں رکھ لیا..... لڑکی نے اسے پانی پلانے سے پہلے کنگھی کنوئیں کی جگت پر

رکھ دی تھی۔ اس کے سنہرے بال اس کے شانوں پر بکھر گئے تھے اور جب وہ پانی پلا کر پلٹی تھی تو نوجوان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور اسی کشمکش میں کنگھی اچھل کر کنویں میں جا گری تھی۔

"یاد ہے۔؟

"کس کو یاد نہ ہوگا۔؟ ہاتھوں کا وہ پہلا لمس جب کنگھی پانی میں گر گئی تھی، جب نگاہ دل میں اتر گئی تھی، جب بالوں کی ہر کرن آفتاب بن گئی تھی۔

"کسے یاد نہ ہوگا۔؟

غوطہ خور پھر باہر نکلا۔ باہر نکل کر پھر اس نے جال الٹ دیا۔ اب اس میں سے ایک لمبی سی چھری نکلی۔

سپید ریش بڈھے نے چھری کو ہاتھ میں لے کر پوچھا۔ یہ چھری کس کی ہے۔؟

چند لمحوں کے لئے اس مجمع میں سے کوئی نہ بولا۔ سب اس چھری کو جانتے تھے۔ اس چھری کا دستہ ہاتھی کے دانت کا تھا۔ اور بے حد خوبصورت تھا۔ یہ چھری جس نوجوان کی تھی وہ بھی اس مجمع میں کھڑا تھا اور سب لوگ اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ سب کو معلوم تھا اُس نے اُس ظالم تھانے دار کو قتل کر دیا تھا جو اُن کے گاؤں کی بہو، بیٹیوں کی عزت کے درپے رہتا تھا۔ مگر اس نوجوان کے خلاف کوئی ثبوت نہ مل سکا تھا اور پولیس کا مقدمہ خارج ہو گیا تھا اور جس نے گاؤں کی عزت لی تھی۔ اس کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹ چکا تھا۔ پانی کی لہروں نے اس چھری کو اس طرح لوگوں کی نظروں سے نہاں کر دیا تھا جس طرح ماں اپنے گناہ گار بیٹے کو اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے۔

پانی میں بڑی طاقت ہے۔

پانی میں انتقام ہے۔

اُس نوجوان کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ یکایک اس نے آگے بڑھ کر بڈھے سپید ریش کے ہاتھ سے چھری اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے کمر بند میں اڑس لی اور فخر اور غرور سے اُس کی ماں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

غوطہ خور پھر جال باہر لایا۔ اب سیاہ رنگ کے کیچڑ میں ہاتھی کے دانت کی بہت سی چوڑیاں تھیں۔

گاؤں کی سب سے نوجوان بیوہ دھیرے دھیرے سسکنے لگی۔ کیونکہ شادی کے روز ہی اس کے دولہا نے زہر کھا لیا تھا اور اس کے دولہا نے اس لئے زہر کھایا تھا کہ اسے کسی دوسرے گاؤں کی لڑکی سے محبت تھی۔ وہ لڑکی جو کبھی اس کی نہ ہو سکی۔ سہاگ رات کو اپنے سامنے شوہر کی لاش دیکھ کر وہ لجیلی اور شرمیلی چیخ کر باہر بھاگ گئی تھی اور اس نے اپنی ساری چوڑیاں اتار کر کنوئیں میں پھینک دی تھیں۔

بڈھا خاموش کھڑا رہا۔

اب وہ نوجوان بیوہ دھیرے دھیرے آگے بڑھی اور جھک کر ایک ایک چوڑی کو بڑی احتیاط سے اپنے دامن میں سمیٹنے لگی۔ جیسے وہ اپنی چوڑیاں نہیں اپنی نادیدہ حسرتیں گن رہی ہو۔ سب چوڑیاں اٹھا کے اس نے اپنے دامن میں ڈال لیں اور پھر سر جھکائے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد بھی دیر تک لوگ خاموش کھڑے رہے۔

بڈھے نے کہا۔ یہ ہمارے پرکھوں کا کنواں ہے۔ یہ ہمیں زندگی بھی دیتا ہے اور موت بھی۔ اس کنوئیں سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

یکایک غوطہ خور پھر نکلا۔ اب اس کا چہرہ نیلا پڑ گیا تھا اور سینہ زور زور سے حرکت کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بہت نیچے، گہرے اتھاہ پانیوں سے کچھ

ڈھونڈ کے لایا ہے.....

غوطہ خور نے بڑی احتیاط سے جال کو کھولا۔ اب کے جال میں کیچڑ کم تھا۔ ریت زیادہ تھی اور اس ریت میں ایک ننھے بچے کی لاش تھی۔

یکایک سب لوگ دو قدم پیچھے ہٹ گئے اور غور سے اس بچے کی لاش کو دیکھنے لگے۔ ان سب کی نگاہیں متوحش اور پھٹی پھٹی سی تھیں۔

سپید ریش بڈھے نے اس مردہ بچے کو اپنے دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھالیا اور بولا۔

" یہ بچہ کس کا ہے۔!

کوئی نہیں بولا۔

کوئی آگے نہیں بڑھا۔

مردوں کے چہرے فق تھے۔ شادی شدہ عورتوں نے گھونگھٹ نکال لئے تھے۔ نوجوان کنواریوں کی نگاہیں نیچی تھیں۔

" یہ بچہ کس کا ہے۔! بڈھے سپید ریش نے درشت لہجہ میں پھر پوچھا۔

سب دم بخود، چپ چاپ کنویں کے گرد حلقہ باندھے کھڑے تھے۔ کسی نے جواب نہ دیا۔ کسی نے اس بچے کو اپنا نہ کہا۔

بڈھے نے مردہ بچے کو غوطہ خور کے حوالے کرتے ہوئے بڑے افسوس سے کہا۔

غوطہ خور اس بچے کو واپس کنویں میں ڈال دو۔

پھر وہ میری طرف تاسف آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ اجنبی! مجھے بے حد افسوس ہے کہ اب یہ کنواں صاف نہ ہو سکے گا۔ تم اپنے بچے کو اس کا پانی پلا کر اسے زندگی نہ دے سکو گے.....

غوطہ خور نے مردہ بچے کو واپس کنویں میں ڈال دیا۔

یکایک میری گود سے میرا بچہ اچھل کر کنویں کی طرف چیختا ہوا بھاگا "ٹھہرو ٹھہرو میں اس بچے سے کھیلوں گا۔

اور پیشتر اس کے کہ میں آگے بڑھوں میرے بچے نے کنویں میں چھلانگ لگا دی۔

" میرا بچہ! میرا بچہ! کہتے ہوئے میں آگے بڑھا مگر گاؤں کے لوگوں نے مجھے روک دیا۔

" دیکھتے نہیں ہو؟ میں نے جھلا کر کہا۔ میرا بچہ اس کنویں میں گیا ہے۔

" وہ اس دوسرے بچے سے کھیل رہا ہے۔ سپید ریش بڈھا آہستہ سے بولا۔

میں نے کنویں میں جھانک کر کہا۔ "بیٹا! بیٹا! واپس آجاؤ۔

کنویں سے ایک زہر خند ہنسی کی آواز آئی جیسے کنویں میں پانی نہ ہو زہر کا جھاگ ہی جھاگ ہو جو اس کنویں سے ابل کر ساری دنیا کی وادیوں، گھاٹیوں اور میدانوں میں پھیل رہا ہو!

لوگ مجھے وہاں سے کھینچ کر پرے لے گئے۔ میں نے دوزانو ہو کر بڈھے کے دامن کو پکڑ لیا اور گڑگڑا کر بولا۔

" میرا بچہ! بابا میرا بچہ مجھے واپس دے دو! میں خود چل کر تیرے کنویں کے پاس آیا ہوں۔ میرا بچہ مجھے واپس مل جائے۔!

" مل جائے گا۔! بابا سیدھا تن کر کھڑا ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی روشنی آگئی۔ دھیرے دھیرے لیکن بڑی مضبوطی سے وہ بولا "تیرا بچہ تجھے واپس مل جائے گا۔ لیکن اس وقت جب کوئی کنواری اس کنویں پر آئے گی اور اس کنویں کی جگت پر جھک کر اس دوسرے بچے کو آواز دے گی اور اسے اپنا بیٹا کہہ کر پکارے گی۔ اسی لمحہ تمہیں تمہارا بچہ مل جائے گا۔"

میں وہاں سے اٹھا اور گاؤں کی عورتوں کے پاس گیا۔

" میرا بچہ مجھے دے دو۔

شادی شدہ عورتوں نے اپنے گھونگھٹ لمبے کر لئے اور میری طرف پیٹھ کر کے کھڑی ہو گئیں۔

" میرا بچہ مجھے دے دو۔

کنواریوں نے اپنے منہ پھیر لئے۔ ان کے ہونٹ زرد تھے اور پلکیں آنسوؤں سے لرزتی ہوئیں.....

" میرا بچہ مجھے دے دو۔

بڈھی عورتیں حقارت سے قہقہہ مار کر ہنس پڑیں۔ وہ حقارت سے ہنس سکتی تھیں۔ کیونکہ ان کی کوکھ اندھی ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا تاکہ وہ لوگ میرے رخساروں پر میرے گرتے ہوئے آنسو نہ دیکھ سکیں۔

بہت دیر کے بعد جب میں نے اپنے چہرے سے اپنے ہاتھ ہٹائے تو وہاں کوئی نہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں اس گاؤں میں اکیلا ہوں جو کہیں نہیں ہے۔ اس کنویں کے کنارے کھڑا ہوں۔ جو ہر چوراہے پر ہے اور اس کنواری کا انتظار کر رہا ہوں جو ایک دن میرے بچے کی جان بچانے کے لئے اس کنویں پر آئے گی۔

---

# ایک دوست کی موت پر

پہلی بار جب میں نے اسے دیکھا تو وہ کانچ کے ایک خوب صورت دریچے کے پیچھے کھڑا ہو کر بڑے باوقار انداز میں مسکرا رہا تھا۔ پہلی ہی نظر میں اسے میں نے پسند کر لیا۔ کیونکہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو پہلی ہی نظر میں اپنے آپ کو پسند کرا لیتے ہیں۔ وہ بالکل لانبا سیدھا، کسی تربیت یافتہ فوجی نوجوان کے انداز میں کھڑا تھا۔ کندنی رنگ، گول چہرہ، چیتے کی سی پتلی کمر اور مضبوط دھڑ سے اس کی وجیہہ شخصیت کا اندازہ کرتے ہوئے میرے دل میں بے اختیار اس کے لئے ایک ایسی گہری کشش محسوس ہوئی کہ میرا دل اس سے ملاقات کرنے، اسے جاننے پہچاننے، اسے اپنا دوست بنانے کے لئے بے تاب ہو گیا۔ اس کی شخصیت میں سب سے اہم اس کے بال تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسے باوقار مردانہ چہرے پر ایسے خوب صورت بال نہیں دیکھے۔ اس کے سر کے بال گہرے سنہرے تھے۔ ایسے گھنے اور ملائم گویا ریشم کے لچھے، اس کی مغرور مسکراہٹ دیکھ کر مجھے احساس ہوا جیسے اسے بھی اپنے خوبصورت بالوں کی اہمیت کا احساس ہے۔ اس کے بال دیکھ کر میرا جی چاہا کہ میں ان میں انگلیاں پھیر دوں، انہیں اپنے گالوں

سے لگالوں ۔ انہیں چوم لوں، ان میں ڈوب جاؤں۔ میں بے اختیار کانچ کا بڑا دروازہ کھول کر اس سے ملنے کے لئے اندر چلا گیا۔

اب تو ہر روز میری اس سے ملاقات ہوتی ہے اور میں ہر روز بڑے پیار سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوں، اس کی ریشمیں زلفوں سے کھیلتا ہوں۔ کبھی ان سے اپنی ٹھوڑی گدگداتا ہوں۔ کبھی اپنے گال کبھی اس کا سر پانی سے بھگو دیتا ہوں۔ کبھی اسے تولیے سے پونچھ کر صاف کر دیتا ہوں اور میرا دوست اب میری کسی حرکت پر معترض نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ میرا شیونگ برش ہے۔ شروع کے چند دنوں میں وہ مجھ سے کچھ اکھڑا اکھڑا سا رہا۔ اس کے بال مجھے چبھتے تھے۔ میری انگلیاں اس کی پتلی کمر سے پھسل جاتی تھیں۔ کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میرے رخساروں سے چھوتے ہی اس کا سارا بدن مجھ سے بغاوت کر رہا ہے۔ اپنی شخصیت کی حفاظت پر تل گیا ہے مگر ہر نئی دوستی اور رفاقت میں یہی ہوتا ہے۔ شروع شروع میں نئے دوست ایک دوسرے کو جانچتے ہیں، ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے قریب آتے ہوئے بھی اپنی ذات کو بچانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ مبادا ان کی شخصیت مجروح ہو جائے۔ دوستی میں ایک باوقار توازن اور فاصلہ رکھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ہر نئی دوستی میں یوں ہی ہوتا ہے۔ سپردگی کی وہ منزل بہت دور ہوتی ہے۔ جب توازن ٹوٹ جاتے ہیں فاصلے مٹ جاتے ہیں اور جھجک غائب ہو جاتی ہے اور ایک آدمی دوسرے آدمی کو اپنا سمجھتے ہوئے بے جھجک اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دینے پر تیار ہو جاتا ہے اور روح کے سارے دروازے اپنے دوست کے لئے کھول دیتا ہے۔ یہ منزل سمجھ کی اور سپردگی کی، ایک دوسرے میں ڈوب جانے کی، بہت دیر میں آتی ہے۔ اس کے لئے وقت چاہئے اور دل کا درد اور وہ لذت آشنا کیفیت جو کچھ پانے سے نہیں بلکہ کچھ کھونے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے شروع شروع میں وہ

مجھ سے کچھ اکھڑا اکھڑا سا رہا۔ کبھی اس کے بال مجھے چبھتے، کبھی بار بار بھگونے سے بھی اس کے بالوں میں نرمی نہ آتی۔ بار بار رگڑنے سے بھی رخساروں پر وہ جھاگ نہ آتا جس کی مجھے توقع تھی اور میں سوچنے لگا کہیں میں نے غلطی تو نہیں کی، اسے پانے میں، اسے اس قدر اپنے قریب لانے میں، ہر نئی دوستی کے شروع میں کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسے آپ مغائرت کی دیوار کو گھونسا مار رہے ہیں اور وہ دیوار نہیں ٹوٹتی اور دوسرے فریق کی مدافعت کی وجہ سے نہیں ٹوٹتی۔ جیسے اس دوستی کو آگے بڑھانے میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ صرف دوسرے فریق کا قصور ہے۔ ہر آدمی اپنے اعتقادات خیالات اور اندھی غرض سے اس قدر بندھا ہوتا ہے کہ دیوار کے دوسری طرف نہیں دیکھ سکتا۔ دوستی کے پہلے دن اس ہوا کی طرح ہوتے ہیں جو گرم گھٹی راتوں میں سانس روک کر کھڑی ہو جاتی ہے اور شبنم کی پہلی بوند یا پھولوں کی پہلی خوشبو کا انتظار کرتی ہے۔

انہی دنوں ایک دن میں نے غصے میں آکر شیونگ برش کو نیچے زمین پر پٹخ دیا۔ زمین پر گرتے ہی برش باتھ روم کے سفید اور سخت ٹائلوں سے ٹکرایا اور لڑھکتا ہوا اس گندی آہنی جالی پر جا گرا جس کے نیچے گندی موری بہتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ دھڑکے قریب اسے چوٹ آئی ہے، کمر کے قریب ایک جگہ سے اس کا سنہرا پالش اکھڑ گیا ہے اور اس کے سنہرے بال صابن کے سفید سفید جھاگ میں لتھڑے ہوئے آہنی جالی کے کوڑے میں غلیظ ہو چلے ہیں۔ سفید سفید جھاگ والے شیونگ برش کو یوں گندگی میں گرتا دیکھ کر مجھے شرمندگی کا احساس ہوا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے کسی صاف ستھرے دھلے دھلائے بچے کو اٹھا کر کسی گندی موری میں پھینک دیا ہو۔

جلدی سے بڑھ کر میں نے اپنے شیونگ برش کو زنگ آلود آہنی جالی سے اٹھا

لیا اور دیوار گیر سنک کی ٹونٹی کھول کر اسے دھونے لگا۔ اسے ٹونٹی کے زور دار کھلے پانی کے نیچے رکھ کر میں اپنے ہاتھوں سے اس کی غلاظت دھونے لگا جو میری ہی دی ہوئی تھی۔ میں نے بار بار اس کا سر پانی سے دھویا۔ بار بار صابن لگایا اور دھویا اور جب برش خوب اچھی طرح صاف ہو گیا تو میں نے بڑی احتیاط سے اسے تولیئے سے پونچھا۔ اس کا سر خشک کیا اور پھر اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے بال انتہائی نرم اور ملائم ہو چکے ہیں اور پھر میں نے دیکھا کہ جب میں اس کے بال دائیں سے بائیں گھماتا ہوا ہوں تو وہ بے حد نرم معلوم ہوتے ہیں۔ یکایک مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور معلوم ہوا کہ اب تک میں اپنے دوست کو غلط گھماتا رہا ہوں۔ نئی دوستی میں اکثر ایسا ہوتا ہے! شیونگ برش نے ایک میٹھی شکایت کے لہجہ میں مجھ سے کہا۔ اپنی غرض سے مجبور ہو کر اکثر انسان اپنے دوست کی شخصیت نہیں دیکھتے، اس کا طریق کار اور زاویۂ نگاہ بھول جاتے ہیں۔ اور اسے غلط طریقے پر گھمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ ایک ذرا سی سمجھ سے معاملہ ٹھیک ہو سکتا ہے۔

میں نے اس کے نرم نرم بال دائیں سے بائیں گھماتے ہوئے ندامت بھرے لہجہ میں کہا۔ تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔؟

شیونگ برش نے جواب دیا۔ "وہ دوستی ہی کیا جس میں زخم نہ ہوں۔

شیونگ برش سے یہ میری پہلی بات چیت تھی۔ بہت سے انسان صرف انسانوں سے بات کرتے ہیں۔ کچھ لوگ جانوروں کو بھی اس میں شامل کر لیتے ہیں۔ لیکن اس سے آگے کوئی نہیں بڑھتا حالانکہ اگر غور کیا جائے تو اس دنیا کی ہر چیز بولتی

ہے۔ کرسی بات کرتی ہے۔ کھٹیا گویا ہوتی ہے، دیوار سرگوشی کرتی ہے۔ گل دان کے پھول نغمہ سناتے ہیں اور راستے کے پتھر ہر آن کچھ کہتے جاتے ہیں۔ محبت، شفقت اور رفاقت سے ہر چیز بولتی ہے۔ سننے اور سمجھنے والا موجود ہو تو کائنات کی کوئی ایک شے کسی دوسری شے سے الگ نہیں رہتی۔ اس لئے اب کی بار جو میں نے اسے پانی میں بھگو کر صابن لگایا اور اسے اپنے رخسار پر دائیں سے بائیں گھمایا تو مجھے اس کے بال پہلے سے کہیں زیادہ ملائم اور نرم معلوم ہوئے اور شیو بھی عمدہ بن گیا اور میں نے اپنے دوست کو بدلنے کا خیال ترک کر دیا۔

آہستہ آہستہ ہم دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہوتے گئے اور مجھے اپنے دوست کے بارے میں نئی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ مثلاً یہ کہ میری طرح اسے بھی ٹھنڈے پانی کے غسل سے نفرت ہے۔ سرد پانی سے اس کا جسم ٹھٹھر جاتا ہے۔ بال سخت ہو جاتے ہیں اور جھاگ بھی زیادہ نہیں آتا۔ بہت گرم پانی سے بھی وہ گھبراتا ہے۔ اس کے سر کے بال ایسے لجلجے سے ہو جاتے ہیں کہ ٹھیک سے شیو نہیں ہو سکتا۔ نیم گرم پانی اس کے لئے بہترین ہے۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ جو اکثر میری گرفت سے پھسل جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ میں اس کی کمر بڑے زور سے پکڑتا ہوں۔ دوست پر جس قدر آپ کی گرفت مضبوط اور سخت ہوگی، اتنا ہی وہ رسیاں تڑا کر آپ سے دور بھاگنے کی کوشش کرے گا۔ اس لئے گرفت ہلکی ہونی چاہئے اور دباؤ مدھم۔ شیونگ برش کو پکڑنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے عورت کی طرح پکڑا جائے اور عورت کو پکڑنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے شیونگ برش کی طرح تھاما جائے تبھی بہترین نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگلے چند مہینوں میں مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ میرے شیونگ برش کو ایک خاص قسم کی

صابن کی ٹکیا پسند آگئی ہے، روزالی۔ اس دوران میں نے بہت سی صابن کی ٹکیاں بدلیں۔ آسطرا، جاکو، تارا، شاہ پسند مگر کسی صابن سے وہ بات پیدا نہ ہو سکی جو روزالی کی خاصیت ہے۔ مرد کی طرح شیونگ برش بھی حسن پرست ہے۔ وہ اپنی صابن کی ٹکیا پہچانتا ہے میں نے شیونگ برش سے کہا۔ یوں دیکھا جائے تو ایک صابن کی ٹکیا اور ایک عورت میں کچھ زیادہ فرق بھی نہیں ہے۔ سبھی عورتیں صابن کی ٹکیا ہوتی ہیں۔ اسی طرح ملائم اور نرم ہوتی ہیں، اسی طرح مہکتی ہیں، صاف ستھری اور اجلی معلوم ہوتی ہیں۔ پیار سے تھوڑی چھوتی ہیں، رخسار چومتی ہیں۔ اور گردن میں بانہیں ڈال کر ہر روز مرد کی حجامت بناتی ہیں۔

برش بولا" مگر صابن کی ٹکیا گھلتی بھی تو ہے۔ یہ شمع سا گھلنا کوئی صابن کی ٹکیا سے سیکھے۔ کسی دوسرے کی خاطر رفتہ رفتہ گھل کر اپنی جان دے دینا اسی مخلوق کا خاصہ ہے اتنی بڑی قربانی تو آج تک کسی شیونگ برش نے نہ دی ہوگی۔ جس دن یہ صابن کی ٹکیا ختم ہو جائے گی تم بازار سے دوسری خرید لاؤ گے۔ ٹکیا مرد کی بے وفا فطرت جانتی ہے پھر بھی ہر آن گھلتی ہے اور گھل گھل کر مرد کے رخسار چمکاتی ہے۔ ایسا ایثار عورت کے سوا اور کس سے ممکن ہے۔؟

میں چپ ہو رہا کیونکہ عمر عزیز کے پینتیس برس گزر جانے کے بعد بھی کنوارا تھا لیکن میں نے اتنا ضرور کیا کہ آئینے کے سامنے اپنے شیونگ برش اور اس کی ٹکیا کو اکٹھا کھڑا کر دیا۔ پھر ان دونوں کو یوں ساتھ ساتھ کھڑے دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کانچ کے کسی بلند و بالا در بچوں والے ہال کے باہر میاں بیوی مسکراتے ہوئے اپنے مہمانوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ دونوں ایسے متبسم اور خوش معلوم ہو رہے تھے کہ جب سے میں

ان دونوں کو ہمیشہ اکٹھا رکھتا ہوں۔ آئینے کے سامنے، البتہ جب کبھی اپنے شیونگ برش سے خفا ہوتا ہوں تو اس کی ٹکیا کو اٹھا کر آئینے کے دوسرے کونے کی طرف الگ رکھ دیتا ہوں۔ اس وقت میرے شیونگ برش کی صورت دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ بڑا مزا آتا ہے مجھے ان دونوں کو اکٹھا کرنے میں اور پھر جب جی چاہے تو الگ کر دیتے ہیں۔ شاید خدا کو بھی کچھ اس طرح کا مزا آتا ہوگا۔

---

دفتر میں ایک بدنام لڑکی تھی، سونی۔ سنا ہے کئی جگہ اس کا معاشقہ چلتا تھا۔ وہ میرے پاس بھی کبھی کبھی آتی تھی۔ بس یوں ہی سی تھی۔ دبلی پتلی، سانولی۔ آنکھوں کے سوا اس کے چہرے میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ بڑی بڑی بادامی آنکھیں اور ابرو کمان کی طرح تنے ہوئے۔ شاید اسے بھی معلوم تھا کہ اس کے پاس آنکھوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس لئے وہ اپنی آنکھوں سے بہت سا کام لیتی تھی۔ اس کی آنکھیں دیکھنے کے علاوہ بولتی بھی تھیں۔ کبھی کبھی ایسا لگتا تھا جیسے سن بھی رہی ہیں۔ کبھی کبھی ہاتھ پھیلا کر اپنے پاس بلاتی تھیں کبھی کبھی آہیں بھر کر سسکتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ کبھی وہ بلی کی آنکھوں کی طرح چالاک دکھائی دیتیں کبھی سقراط کی آنکھوں کی طرح فلسفے میں ڈوبی ہوئی۔ کبھی بچوں کی طرح بھولی اور مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوتی کہ ایک مرد اپنی آنکھوں سے کتنا کام لے سکتا ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ جس کے پاس جو ہوتا ہے، وہ اسی سے کام لیتا ہے۔

میں اس سے محبت نہیں کرتا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ بھی مجھ سے محبت نہیں کرتی بس یوں ہی میرے پاس چلی آتی ہے۔ دوسروں سے اکتا کر اور وہ دوسرے بھی غالباً میری طرح زمانے سے، حالات سے، زندگی سے، ایک دوسرے سے اکتائے ہوئے ہوں گے اور اسی

طرح سلسلے وار ایک سے، دوسرے سے، تیسرے تک یہ یکسانی اور اکتاہٹ کی زنجیر چلتی ہے۔ جس میں کسی فرم، کسی دفتر یا کسی مل کی چھوٹی سی نوکری ہوتی ہے، رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا نیم تاریک، بدبودار، سیلا ہوا کمرہ ہوتا ہے۔ جس میں ایک طرف بانس کی کھپچیوں کے بک شیلف پر بہت سی کتابیں اور فائلیں پڑی رہتی ہیں۔ دوسرے کونے میں کتابوں اور رسالوں کا بہت بڑا ڈھیر پڑا رہتا ہے، دو تین کرسیاں ہوتی ہیں ایک ٹوٹا سا اسٹول ہوتا ہے اور ایک چھوٹی سی میز ہوتی ہے جو بیک وقت کھانے کی میز، مطالعے کی میز، تاش کی میز اور مہاجنوں کے سونے کا کام دیتی ہے جس پر کسی زمانے میں ایک خوب صورت میز پوش بچھا ہوا ہوگا۔ لیکن جس کا گہرا سبز رنگ اب متواتر استعمال سے اور نہ دھلنے سے سیاہی مائل ہو چلا ہے۔ جس کے گلابی کنارے پر چھپی ہوئی اجنتا کی حسیناؤں کے چہروں پر پانی کے دھبے، سگریٹ کی راکھ، شوربے کی چکناہٹ، فونٹین پین کی سیاہی اور صابن کا جھاگ جما ہوا ہے اور ان سب کے نیچے بان کی ایک جھلنگا چارپائی ہوتی ہے جس پر بیٹھے بیٹھے آدمی زندگی کے سب کام کر سکتا ہے۔ اسی پر آلتی پالتی مار کر کھانا کھا سکتا ہے۔ پائنتی پر فائلیں رکھ کر کام کر سکتا ہے۔ میز قریب گھسیٹ کر شیو کر سکتا ہے۔ عورت کو قریب گھسیٹ کر محبت کر سکتا ہے، بچے پیدا کر سکتا ہے، جی سکتا ہے، سو سکتا ہے۔ مر سکتا ہے۔ آخر ہمارے ایسے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو ایک بان کی کھاٹ کے سوا اور چاہیئے بھی کیا اور میرے ایسے سست الوجود اور کاہلی کے مارے ہوئے آدمی کے نزدیک تو جنت کا تصور بان کی کھاٹ سے زیادہ نہیں ہے جس پر بیٹھے بیٹھے بھی زندگی کے سارے کام سرانجام دیئے جا سکتے ہیں اور میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا کہ وہ کس طرح کی جنت ہوگی۔ جس کے لئے دنیا کے لوگ دن رات اتنی بڑی نیکیاں کرتے پھرتے ہیں۔

یہ نیکیاں جن کے چمکتے ہوئے خول کے اندر خود غرضی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کس طرح کی جنت ہمیں دیں گی۔؟ کیا اس سے یہ بہتر نہیں ہے کہ آدمی بان کی ایک چھوٹی سی کھٹیا پر لیٹ جائے اور چپکے چپکے نیلے آسمان کو دیکھ کر رو دیا کرے یا خوب صورت عورتوں کو ہولے ہولے گلی سے گزرتے دیکھ کر مسکرایا کرے یا بلی کے بچوں کو ایک دوسرے سے کھیلتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوا کرے۔ کبھی کبھی نیکی کرنے سے مجھے یہ کام بہت بہتر معلوم ہوتے ہیں۔

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جس دن سونی آجاتی تھی اور ہمیں کوئی بیہودہ سی فلم دیکھنے کے لیے باہر نہیں جانا ہوتا تھا تو میرے کمرے کا نقشہ بدل جاتا تھا۔ پہلے تو وہ اپنی ساڑی کا پلو اپنی کمر کے گرد لپیٹ کر کمرے میں جھاڑو دیتی تھی۔ پھر میرا ایک شیلف ٹھیک کرتی تھی۔ کتابوں اور رسالوں کے ڈھیر کی چھان پھٹک کرنے کے بعد رسالے الگ کرتی تھی اور کتابیں قطار وار الگ فرش پر سجا دیتی تھی اور پھر ہاتھ منہ دھو کر میرے قریب آکر بان کی کھاٹ پر بیٹھ جاتی تھی اور میں ان تمام کاموں کے بدلے میں اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے ایک بوسہ دیتا تھا۔ جیسے جھاڑو بہارو کا کام ٹھیک سے کرنے پر ہم بھنگی کو ایک دونی دے دیتے ہیں۔

اسی طرح وہ کبھی کبھار آتی رہی اور زندگی کو برداشت کرنے کا یہ سلسلہ نیم بیزاری اور نیم اکتاہٹ کے عالم میں چلتا رہا لیکن ایک دن جو وہ آئی تو میں نے اسے عجیب رنگ میں پایا۔ وہ بے حد کھوئی کھوئی اور گم سم اور کبھی کبھی وحشت زدہ سی دکھائی دیتی اور گھبرا گھبرا کے میری طرف دیکھتی۔ جب میں نے پوچھا کیا بات ہے تو کچھ نہیں کہہ کر بار بار گاتی رہی۔ پھر پریشان ہو کر اپنی ساڑی کا پلو اپنی انگلی پر لپیٹتی رہی اور کھولتی رہی۔ ہار کر میں اس کے ذہنی خلفشار کی طرف سے انجان بن گیا۔ اور باتھ روم سے شیو کا سامان اٹھا لایا اور وہیں میز کے گھسیٹ

کے اس کے سامنے شیو کی تیاری کرنے لگا۔ آخر وہ بولی "تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے۔؟

"کیوں کر لوں۔؟

وہ بہت دیر تک خاموش رہی۔ آخر اس کے سینے سے ایک سرد آہ نکلی۔ بالکل گھبرا کر بار بار سر ہلا کر بولی۔ میں ..... میں اس زندگی سے عاجز آ گئی ہوں۔

"تو اپنی مصیبت مجھ پر کیوں لانا چاہتی ہو۔"

"تم سے نہ کہوں تو پھر کس سے کہوں۔؟ جواب میں میرے ذہن میں بہت سے نام آئے مگر میں چپ رہا۔ اس نے بڑی سختی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی "کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے ہو۔"

"نہیں۔"

غالباً اس جواب کی اسے توقع نہیں تھی۔ کیونکہ یہ سنتے ہی اس نے فوراً ہاتھ چھوڑ دیا۔ ایک لمحہ کے لئے میری طرف پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھا پھر ٹھس ہو کر بیٹھ گئی اور میں چپ چاپ شیو بناتا رہا اور جب شیو بنا چکا تو اس نے صابن کے جھاگ سے بھرا ہوا شیونگ برش اٹھا لیا اور اسے دھیرے دھیرے اپنے رخساروں پر پھیرنے لگی "کیا کر رہی ہو؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔"

"مرد بننا چاہتی ہوں۔ اس نے سسکتے سسکتے کہا۔"

جب وہ چلی گئی تو شیونگ برش نے مجھ سے کہا۔ تم کتنے کڑوے اور کھردرے ہو۔ کیا تم میری طرح کسی دوسرے کی مصیبت پر جھاگ نہیں لگا سکتے۔ جھاگ لگانے سے زندگی کے بہت سے کانٹے نرم پڑ جاتے ہیں۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔؟

سب سمجھتا ہوں؛ میں نے کہا۔ لیکن کیا کروں؟ میرے ذہن میں جس بیوی کی تصویر بسی ہے، اس پر سونی پوری نہیں اترتی اور جو پوری اترتی ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لئے میری تنخواہ پانچ سو روپے ہونی چاہیئے۔ تم سمجھتے ہو، میں شادی نہیں کرنا چاہتا، مگر کس سے کروں شادی اور کہاں ہے وہ گھر جس کے آنگن سے مجھے آسمان نظر آتا ہو اور کہاں رکھوں گا میں اپنے بچوں کو؟ اس نیم تاریک بدبودار مرغیوں کے دڑبے میں۔؟ تو پھر ہم اپنے آپ کو انسان کیوں کہتے ہیں۔ صاف صاف مرغیاں اور بھیڑیں اور بکرے کیوں نہیں کہتے۔ اس لفظی رعایت کا کیا فائدہ؟ جبکہ میری تنخواہ ایک سو ساٹھ روپے ہے اور سال میں تین روپے کی ترقی مجھے ملتی ہے اور تین سال بعد جب میرے ہاں تین بچے ہو جائیں گے تو جناب! میں تو ان تین بچوں کو نو روپے ماہانہ پر نہیں پال سکتا۔ اگر میں اپنے خوابوں کی دیوی سے نہیں، سونی سے بھی شادی کر لوں تو بھی نہیں پال سکتا۔

دوسرے دن دفتر میں سونی مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔ معلوم ہوا کہ اس نے استعفا دے دیا ہے اور کہیں چلی گئی ہے۔ میں بھونچکا سا رہ گیا۔ اس طرزِ عمل کی مجھے اس سے امید نہ تھی۔ میں تھوڑا سا خوش بھی ہوا کہ چلو کسی نے میری خاطر اپنے آپ کو پریشانی میں تو ڈالا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں بھی کچھ ہوں۔ پھر میرے خیالات نے دوسری راہ اختیار کی۔ اونہہ؟ کہیں جھنجھلا کر چلی گئی ہوگی۔ کسی نہ کسی سے وہ ضرور شادی کر لے گی کوئی نہ کوئی احمق اسے ضرور مل جائے گا۔

دن پھر اسی یکسانی سے گزرنے لگے۔ اسی اکتاہٹ اور بیزاری سے جو میری طبیعت کا خاصا بن چکی تھی۔ اس دوران جون آئی جس کے بال بھورے تھے اور ایملی

آئی اس کی آنکھیں بھوری تھیں اور وہ ملا آئی جس کی ناک چپٹی تھی اور۔ نام گنانے سے کیا فائدہ ؟ ان سب کی صورتیں گو مختلف تھیں، لیکن وہ سب ایک سی تھیں۔ وہ سب بہت سوں میں سے کسی اک کو تلاش کر رہی تھیں اور ہم بھی بہتوں میں سے کسی ایک کو ڈھونڈ رہے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم سب لوگ کسی بہت بڑے کھنڈر میں آ نکلے ہیں اور ایک دوسرے کے چہروں کی بھول بھلیوں میں اپنا راستہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ ایک راستہ دوسرے راستے کو کاٹتا ہے، ایک چہرہ دوسرے چہرے کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک نگاہ گہری پہچان کی ملتی ہے مگر دوسرے ہی لمحہ وہ چہرہ مکمل اجنبی ہو جاتا ہے اور راہی مایوس ہو کر پھر اپنی تلاش پر آگے دوڑنے لگتا ہے اور سارا کھیل یوں لگتا ہے جیسے کسی اندھیری غلام گردش میں بہت سے چوہے مختلف سمتوں میں ایک دوسرے پر پھلانگتے ہوئے جا رہے ہوں۔

اپنی بے معنی، بے مقصد زندگی سے عاجز آ کر میں نے ایک دن فرم کی ملازمت سے استعفا دے دیا اور سول نافرمانی کی تحریک میں شامل ہو گیا۔ کیونکہ جب کبھی کوئی نیا وائسرائے ہندوستان میں آتا تھا۔ میرا جی اس کا گلا گھونٹ دینے کو چاہتا تھا۔ مجھ سے پہلے میرے باپ کا بھی یہی جی چاہتا تھا اور اس سے پہلے میرے باپ کے باپ کا اور اس طرح نسلوں اور پشتوں سے جمع ہوتی ہوئی یہ نفرت مجھ تک پہنچی تھی اور جب اس نفرت کی حدت سے میرا خون کھولنے لگا اور جب فرم کے انگریز منیجر کو دیکھ کر مجھے بخار سا چڑھنے لگا تو میں نے فرم کی ملازمت چھوڑ دی اور سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لینے لگا۔ کیونکہ نفرت ایک مرض ہے اور جب تک آدمی اسے اپنے جسم اور روح کی اسٹیم سے خارج نہ کر دے، اسے چین نہیں آ سکتا اس لئے جب مجھے دو سال کی قید ہوئی تو قرار

سا آگیا، دل کو ایک تسکین ہوئی۔ جیسے مرض سے نجات مل گئی ہو۔ جیل کی زندگی سے مجھے کسی طرح کی حیرت نہیں ہوئی۔ جو آدمی زندگی بھر ایک تنگ و تاریک کھولی میں رہنے کا عادی ہو، اسے جیل کی بیرکیں کیوں بری معلوم ہوں گی۔ جس آدمی نے اپنی ساری زندگی چھونپڑے جیسے ڈھابوں کا غلیظ کھانا کھا کر بسر کی ہو، اُسے جیل کا کھانا کیوں برا معلوم ہوگا۔ جو آدمی ایک چھوٹی سی میز پر، چار فٹ لمبی اور تین فٹ چوڑی میز پر ایک کونے میں صبح سے شام تک سر جھکائے دس گھنٹے کام کرنے کا عادی ہو، اسے جیل کی مشقت سے کیا تکلیف ہوگی؟ یہ جیل بہت بڑی تھی اور اس میں سینکڑوں قیدی تھے اور لمبی لمبی دیواروں کے اندر گھاس کے میدان تھے اور درختوں کی قطاریں تھیں اور پھولوں کے قطعے تھے اور رات کو بیرکوں کے باہر چاندنی چھٹکتی تھی اور ہار سنگھار کے پھولوں کی خوشبو آتی تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ آسمان نظر آتا تھا۔ اور دو وقت ہر ایک کو کھانا ملتا تھا۔ جو جیل سے باہر ہر کسی کو کہاں ملتا ہے اور رہنے کو ایک فرش اور ایک چھت ملتی ہے۔ یہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ سردیوں میں جب فٹ پاتھ بہت ٹھنڈے ہوتے ہیں اور برساتوں میں جب وہ بہت گیلے ہوتے ہیں، بہت سے غریب لوگ بے گھر لوگ چھوٹے موٹے جرائم کر کے جیل آجاتے ہیں اور مزے سے تین چار ماہ گزار کر چلے جاتے ہیں۔ وہ لوگ دراصل جرم نہیں کرتے بلکہ حالات سے ایک طرح کی سول نافرمانی کرتے ہیں اور یہ سول نافرمانی ہزاروں سال سے جاری ہے اور بڑی بڑی جیلوں کے باوجود اس وقت تک جاری رہے گی۔ جب تک باہر کی دنیا میں عام آدمیوں کو وہ سہولتیں بہم نہ پہنچائی جائیں گی جو بڑی سے بڑی جیل میں بھی ایک عام قیدی کو حاصل ہوتی ہیں۔

جیل میں مجھے تیسرے درجے میں رکھا گیا تھا۔ جہاں میری طرح کے سینکڑوں لوگ

مجھ سے پہلے سے موجود تھے اور جن کی زندگیاں مسلسل ایک تیسرے درجے کا سفر کر رہی تھیں۔ یہاں ہم سب لوگوں کو ایک سے کپڑے دیئے گئے تھے اور مزے کی بات یہ تھی کہ ہمارا کوئی نام نہ تھا۔ ہم سب نمبر تھے اور میرا نمبر ۵۴۱ تھا اور میری بیرک کے تالے کا نمبر ۱۱۷ تھا۔ اور میرے شیونگ برش کا نمبر ۲۳۱ تھا اور یہاں آکر پہلی بار میں نے ایک انسان کے مقابلے میں اپنے آپ کو ایک آہنی تالے اور لکڑی کے ایک شیونگ برش کے بہت قریب محسوس کیا اور شاید اسی لئے بہت محظوظ بھی ہوا اور مجھے اندازہ ہوا کہ میری طرح کے سست اور کاہل انسانوں کے لئے جیل بہترین جگہ ہے، جو لاکھوں آدمیوں کو جنگ کی بھٹی میں نہیں جھونک سکتے جو بان کی ایک کھٹیا پر لیٹ کر صرف خواب دیکھ سکتے ہیں۔

میں جیل میں اپنا شیونگ برش لے گیا تھا اور جیل کے ساتھیوں میں میرا شیونگ برش بہت مقبول ہو گیا تھا کیونکہ وہ واقعی ایک عمدہ شیونگ برش تھا اور بڑی محنت سے اپنا کام کرتا تھا۔ حالانکہ جیل میں عمدہ صابن اور عمدہ بلیڈ دستیاب نہیں ہو سکتے تھے پھر بھی شیونگ برش بڑی تن دہی سے اپنا کام کئے جاتا تھا اور ہر روز تقریباً دس بارہ آدمیوں کے شیو کرتا تھا۔ ان آدمیوں میں اناؤ کا بھگیلو اہیر بھی تھا۔ بھگیلو اہیر ساڑھے چھ فٹ کا اونچا لانبا احمق تھا جو انگریزوں کی فوجی ٹرین کے آنے سے قبل ریل کی پٹڑی اکھاڑتے ہوئے پایا گیا تھا اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے صرف سات سال کی سزا ہوئی تھی۔ اس کی چھاتی بڑی چوڑی تھی اور داڑھی بڑی سخت اور گردن بیل کی طرح مضبوط تھی۔ وہ اکثر اپنے وارڈروں سے جھگڑا کرتا تھا۔ ایک دن وہ بالکل پاگل ہو گیا۔ اس نے اپنے وارڈر کا جبڑا توڑ دیا۔ اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، میرا آئینہ توڑ دیا اور میرے شیونگ برش

کو بار بار اٹھا کر دیوار پر دے مارا حتیٰ کہ اس کے خول کا کروم نما چھلا ٹوٹ گیا اور میرے شیونگ برش کے سارے خوب صورت بال زمین پر گر گئے۔ بڑی مشکل سے ہمارے بہت سے ساتھیوں نے اسے تھاما اور اسے پکڑ کر وارڈروں کے حوالے کر دیا۔ اگر شیونگ برش اس قدر خوب صورت اور کارآمد نہ ہوتا تو کسی کو اس سے ہمدردی نہ ہوتی مگر میرا شیونگ برش خوب صورت اور کارآمد ہونے کے علاوہ بے قصور بھی تو تھا اس لئے کسی نے اس کا ٹوٹا ہوا چھلا اٹھایا، کسی نے اس کا لکڑی کا خول۔ دو تین آدمیوں نے مل کر اس کے نرم اور ملائم بال چن کر جمع کئے۔ ایک وارڈر نے بالکل اسی سائز کا پیتل کا چھلا مجھے دینے کا وعدہ کیا اور دو تین دن کی سرجری اور مرہم پٹی کے بعد میرا شیونگ برش پھر اپنے محاذ پر موجود تھا۔ اس کے جسم پر بہت سے زخموں کے نشان تھے اور اس کے سر کے کچھ بال بھی غائب تھے۔ اور نصف سے زیادہ اس کا پالش بھی نکل گیا تھا۔ اور اس کی چوبی ہتھی پر کروم کے بجائے پیتل کا ایک بدنما چھلا تھا مگر وہ پھر سے کام کر رہا تھا اور اپنی زندگی، افادیت اور شخصیت کا ثبوت دے رہا تھا۔ گو وہ اب جوان نہ رہا تھا۔ خوب صورت نہ تھا بلکہ کسی قدر عمر رسیدہ معلوم ہوتا تھا اور بہت مدت بعد مجھے اس کے لہجہ میں شکایت سی محسوس ہوئی "تم اپنے دوستوں کو برتنا نہیں جانتے۔ وہ بولا۔ اس کمبخت بھگیلو کے بال بڑے سخت ہیں اسے میرے جیسا برش نہیں چاہیئے۔؟ سور کے بالوں والا برش چاہیئے۔ تم نے مجھے اس کے حوالے کیوں کیا۔؟ میں ایسے سخت بالوں اور کڑے رخساروں پر کام کرنے کا عادی نہیں ہوں دوستی وہیں مضبوط ہوتی ہے۔ جہاں شدید اختلاف کے باوجود کچھ قدریں مشترک ہوں۔ تم نے میرے اور بھگیلو کے درمیان کون سی قدر مشترک دیکھی۔؟ دوست کو غلط ہاتھوں میں نہیں دینا چاہیئے۔ یہ دوستی کی توہین ہے۔

"اتنے رئیس مت بنو۔ مت بھولو کہ تم ایک غریب آدمی کے برش ہو اور بھگیلو بھی ایک غریب آدمی ہے اور یہی غریبی تم دونوں میں مشترک ہے۔"

"لیکن میرا قصور کیا تھا۔؟ برش نے پوچھا۔"

"تم بے گناہ تھے۔ اس سے بڑا قصور اس دنیا میں اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے برش کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ بھگیلو بھی تمہاری طرح بے قصور ہے۔ اسے غصہ آگیا تھا کیونکہ جب سے وہ جیل آیا ہے' اس کی بیوی بھاگ گئی ہے۔ اس کے چچا نے اس کی زمین پر قبضہ کر لیا ہے اور اس کی ماں کنویں میں گر کر مر گئی ہے۔ ان حالات میں کوئی بھی شخص پاگل ہو سکتا ہے۔

"تم میرے مالک تھے۔ برش نے رنجیدہ لہجہ میں کہا۔ تم میری جان بھی لے لیتے تو مجھے غم نہ ہوتا۔"

"میرے دوست! میں تمہیں امریکی شاعر پیچن کے دو مصرعے ترجمہ کر کے سناتا ہوں۔ سنو! وہ چیز جو سب کی ہے اس کا کوئی ایک مالک کیسے ہو سکتا ہے۔؟ وہ جسے سب استعمال کرتے ہیں اسے کون مار سکتا ہے۔؟ اگر تم نے دو دن پہلے کا وہ منظر دیکھا ہوتا۔ جب دو درجن ہاتھوں نے تمہاری زندگی ریزہ ریزہ کر کے جیل کے فرش سے اٹھالی اور اسے از سر نو ترتیب دیا۔ تم بھگیلو کو یقیناً معاف کر دیتے کیونکہ کسی ایک شخص کی زندگی صرف اس کی اپنی نہیں ہے۔ ایک شخص کی زندگی میں سینکڑوں لوگ' ہزاروں حالات اور لاکھوں کروڑوں خلیے حصہ لیتے ہیں۔ پھر تم صرف اپنے کیسے ہو سکتے ہو یا صرف میرے کیسے۔؟

---

جیل سے رہا ہو کر میں اپنے شہر واپس آگیا اور دفتر دفتر ملازمت ڈھونڈنے لگا۔ ملک آزاد ہو چکا تھا اور اس کی آزادی کی جدوجہد کا ایک چھوٹا سا خلیہ میں بھی تھا اور بھگیلو اہیر

بھی اور ہماری طرح کے دوسرے بہت سے لوگ جن کے نام تاریخ کے کسی صفحے پر اور سڑک کے کسی کھمبے پر نہ ہوں گے۔ کیونکہ لوگ ہمیشہ پھولوں کو دیکھتے ہیں۔ کھاد کی طرح گندے میلے کچیلے غلیظ غریب آدمیوں پر ان کی نظر کہاں جاتی ہے۔

تین ماہ کی کاوش کے بعد مجھے ایک دفتر میں ایک سو چالیس روپے کی نوکری مل گئی۔ نوکری ملنے کے چند دن بعد مجھے اپنے دوست کا مکان چھوڑ دینا پڑا۔ کیونکہ اس کی بیوی میکے سے آنے والی تھی۔ اس لئے میں اپنا سوٹ کیس لے کر نکل کھڑا ہوا کسی کھولی کی تلاش میں اور سب سے پہلے میرے ذہن میں اپنے پہلے گھر کا خیال آیا۔ ممکن ہے، وہ خالی ہو۔ مگر اتنے عرصے تک اتنے بڑے شہر میں کوئی گھر خالی کیسے رہ سکتا ہے؟ اس کے باوجود میرے قدم مجھے اسی پرانے گھر کی طرف لے گئے۔ ممکن ہے اسی بلڈنگ میں کوئی دوسری کھولی خالی ہو۔ مالک مکان سے میرے مراسم اچھے تھے، وہ کوئی انتظام کر دے گا لیکن اس بلڈنگ کے اندر پہنچ کر میں مالک مکان کے دفتر میں نہیں گیا۔ جو گراؤنڈ فلور پر واقع تھا بلکہ دو منزل سیڑھیاں چڑھ کر اپنا پرانا گھر دیکھنے گیا۔ دروازے پر تالا نہیں تھا۔ مگر وہ اندر سے بند تھا اور کہیں اندر سے برتن کھنکنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے بے اختیار دروازہ کھٹ کھٹا دیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے چاپ سنائی دی اور کسی نے دروازہ کھولا۔ میں نے دیکھا کہ دروازے پر سونی کھڑی ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرا دی۔ آگے بڑھ کر اس نے میرا سوٹ کیس میرے ہاتھ سے چھین لیا اور مجھے کھینچ کر اندر لے گئی۔ اور دروازہ بند کرتے ہی میرے سینے میں منہ چھپا کر بولی: "دو سال سے میں نے یہ گھر تمہارے لئے تیار رکھا ہے۔ میرا خیال تھا۔ کبھی نہ کبھی تم ضرور آؤ گے۔ آؤ۔ دیکھو، اپنا گھر!" میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے زور سے اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور چند لمحوں کے مکمل سناٹے میں ہم دونوں ایک دوسرے

سے لگے لگے کانپتے رہے پھر اس نے آہستہ سے اپنا سر میرے سینے سے ذرا سا ہٹا کر مجھے دو تین بار زور سے سونگھا اور مسکرا کر بولی: "ہائے تمہارے سینے سے کیسی کورے گھڑے کی کچی کچی خوشبو آتی ہے۔"

---

ہر ڈال میں پھول آتے ہیں اور ہر خلا ستاروں سے بھر جاتی ہے۔ میری زندگی بھی چھوٹی چھوٹی خوب صورتیوں سے بھرنے لگی اور اس نیم تاریک کھولی میں بھی گھریلو زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں ننھے ننھے دیوں کی طرح جگمگانے لگیں۔ دو سال بعد میرے گھر میں ایک بچی پیدا ہوئی۔ وہ میری گود میں بیٹھ جاتی تھی اور غوں غاں کرتے ہوئے ایک عجیب زبان میں میرا اخبار پڑھتی تھی۔ کبھی کبھی اپنا پورا ہاتھ میرے منہ میں ڈال کر میری زبان پکڑنے کی کوشش کرتی تھی اور میری ٹائی پکڑ کر اس سے جھولنے کی کوشش کرتے ہوئے بے اختیار کھل کھلا کر ہنس پڑتی تھی۔ اسے میرا شیونگ برش بھی بہت پسند تھا۔ وہ اکثر میری نقل کرتے ہوئے شیو کرنے کی کوشش کرتی تھی اور کئی بار اس نے صابن کے جھاگ سے اپنا چہرہ بھر لیا اور تالی بجا کر کہنے لگی۔ آہا، میں پپا ہوں، ممی دیکھو، میں پپا ہوں۔

میں اپنی بچی کے لئے ایک خوب صورت پنگوڑا لایا اور سونی نے اس کے لئے بڑے خوب صورت فراک لئے اور میں نے شدید جدوجہد کے بعد سوا دو سو روپے کی ایک بہتر ملازمت بھی حاصل کر لی کیونکہ اس بچی کے لئے میرے حوصلے اور عزائم بلند ہو چلے تھے۔ میں اپنی بچی کو بہترین کھانا دوں گا۔ بہترین کپڑے اور بہترین تعلیم اور وہ شادی کے بعد کسی کھولی میں نہیں بلکہ پانچ کمروں والے جگمگاتے ہوئے کسی عمدہ فلیٹ میں جائے گی۔ اسی طرح ماں باپ خواب دیکھتے ہیں۔

ایک دن جب میں شیو کی تیاری کر رہا تھا اور شیونگ برش کو صابن کی ٹکیا سے رگڑ کر جھاگ پیدا کر رہا تھا۔ میری بیوی ایک کونے سے چلائی۔ دیکھو تو آشا کو کیا ہوگا ہے۔! اس کے چہرے پر وحشت اور خوف کا شدید تاثر تھا۔ میں نے صابن سے لتھڑا ہوا شیونگ برش وہیں چھوڑا، تولیے سے منہ صاف کیا اور آشا کی طرف بڑھا اور اس کا منہ کھول کر غور سے اندر دیکھنے لگا۔ بچی کا منہ اندر سے سوجتا جا رہا تھا اور اسے سانس لینے میں بھی تکلیف ہو رہی تھی۔ میں فوراً اسے گود میں اٹھاتے اٹھاتے سیڑھیوں کے نیچے بھاگا اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے دوا اور انجیکشن دیتے ہوئے بتایا کہ بچی کو ڈپتھیریا ہو گیا ہے۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر چل بسی۔

تین دن تک میں دفتر نہیں گیا۔ کپڑے نہیں بدلے، شیو نہیں کیا۔ اپنی کھاٹ پر لیٹے لیٹے چھت کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک کونے میں پنگوڑا پڑا تھا اور اس پر بچی کے فراک پڑے تھے جو ابھی ابھی دھوبی سے دھل کر آئے تھے۔ جس طرح میری بچی کے فراک دھوبی سے دھل کر آئے ہیں، کیا اسی طرح میری بچی مرگھٹ سے واپس نہیں آسکتی۔؟ سونی نے روتے روتے مجھ سے پوچھا۔ میں نے بیزار ہو کر منہ پھیر لیا۔ میں کیا جواب دوں۔ میں کوئی خدا ہوں۔؟

چوتھے روز سونی نے مجھے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بستر سے اٹھایا۔ کیا اسی کھاٹ پر لیٹے لیٹے مر جانے کا ارادہ ہے۔ دفتر نہیں جاؤ گے۔ اٹھو، شیو کرو، کپڑے بدلو اور کام پر جاؤ۔

میں شیو کرنے لگا۔ معلوم ہوا کہ شیونگ برش اس وقت سے صابن میں لتھڑا ہوا پڑا تھا۔ جس وقت میں پلٹ کر بچی کا منہ دیکھنے کے لئے مڑا تھا۔ صابن کا جھاگ اس کے بالوں میں سوکھ گیا تھا اور وہ ان سفید سفید بالوں میں بہت بڈھا اور سوکھا ہوا اور غم زدہ معلوم

ہو رہا تھا۔ میں نے نل کھول کر باتھ روم میں اس کے بالوں سے سوکھا ہوا صابن چھڑایا اور اسے اچھی طرح سے صاف کر کے جب شیو کرنے لگا تو مجھے اس کا لمس بے حد ملائم مکھن کی طرح نرم اور بالائی کی طرح ریشمیں معلوم ہوا۔ ایک لحظے کے لیے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ تو مجھے ایسا لگا گویا یہ برش کے بال نہیں ہیں۔ میری بچی کی ننھی ننھی انگلیاں ہیں جو بڑے پیار اور محبت سے میرے رخساروں سے کھیلتی ہوئی صابن کے جھاگ کی دھاریں بکھیر رہی ہیں بے اختیار میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بہہ نکلی اور آنسو میرے رخساروں پر بہہ بہہ کر صابن کے جھاگ میں ملنے لگے اور مجھے ایسا لگا جیسے میرا شیونگ برش بھی میرے ساتھ رو رہا ہے اور انتہائی رفاقت سے ہولے ہولے میرے رخسار تھپک رہا ہے۔

---

ڈیڑھ سال بعد ہمارے ہاں ایک اور بچی پیدا ہوئی لیکن مری ہوئی۔ پھر تیسرے برس ایک لڑکا پیدا ہوا لیکن وہ بھی مرا ہوا۔ اس واقعے کے چند ماہ بعد سونی اچانک مجھے چھوڑ کر کہیں چلی گئی۔ اس نے مجھے نہ کچھ بتایا، نہ کہا، نہ میرے لیے کوئی خط چھوڑا۔ چپ چاپ کہیں غائب ہو گئی۔ بہت جگہوں پر میں نے اسے ڈھونڈا اور بہت عرصہ تک میں نے اسکی تلاش کی لیکن وہ مجھے کہیں نہ ملی۔ میں پھر اپنی کھولی میں اکیلا رہ گیا۔

اب مجھے جو کچھ کہنا ہوتا ہے۔ اپنے شیونگ برش سے کہتا ہوں۔ کیونکہ آدمی صرف نفرت کرنے والا، صرف لڑنے جھگڑنے والا صرف کام کرنے والا انسان نہیں، وہ محبت کرنے والا انسان بھی ہے اور جب انسان اس کی بات نہ سنیں تو وہ کسی سے تو اپنے دل کا درد کہے گا۔ چاہے وہ لکڑی کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو۔ آٹھ سال سے میں اور میرا شیونگ برش اس کھولی میں ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ میرا شیونگ برش بہت بڈھا ہو چلا ہے۔ میری

طرح اس کے سر کے بال جھڑ گئے ہیں۔ لکڑی کے دستے کا سارا پلستر اکھڑ چکا ہے اور لکڑی میں بھی گہری گہری دراڑیں پڑتی جا رہی ہیں اور اس کا بدنما پیتل کا خول جگہ جگہ سے یوں ہلتا ہے جیسے بڈھے منہ میں دانت ہلتے ہیں لیکن عمر کے ساتھ ساتھ وہ بہت سیانا اور دانا ہو گیا ہے۔ میں گھنٹوں اس سے باتیں کیا کرتا ہوں اور اس کی باتیں سنا کرتا ہوں جو اس کے لکڑی کے دستے نے کبھی جنگل کے درختوں سے سنی تھیں۔ جو اس کے بالوں نے غیر پالتو جانوروں سے مستعار لی تھیں۔ قدرت کا قانون، جانور کا سلیقہ اور انسان کی ہوشمندی اور زندگی کا گہرا دردناک تجربہ بھی اس میں شامل ہیں۔

آٹھ برس بعد آج مجھے سونی کا خط ملا ہے۔ سونی مجھے واپس بلا رہی ہے۔ سونی نے دوسری شادی کر لی تھی۔ اس شادی سے اس کے دو بچے پیدا ہوئے، دونوں لڑکے، دونوں زندہ ہیں۔ ایک کی عمر سات سال ہے، دوسرے کی پانچ سال۔ سونی کا دوسرا شوہر مر چکا ہے اور اب سونی اپنے دونوں بچوں کو لے کر بھی اکیلی ہے۔ شاید وہ تو اب اپنی باقی زندگی کسی شوہر کے بغیر بسر کر سکتی ہے۔ لیکن اس کے بچوں کو ایک باپ کی شاید ضرورت ہے۔

"تمہیں جانا چاہیئے۔ شیونگ برش نے دوسرے دن مجھے صلاح دی۔"

"میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔ سونی نے مجھے دھوکہ دیا، بے وفا نکلی۔"

"وہ تم سے بے وفا نہیں تھی، اپنی کوکھ کی وفادار تھی۔ ہر عورت اپنی کوکھ کی عزت کی محافظ ہوتی ہے۔ برش نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ جب دوسرے ہوتے بچے پیدا ہوئے تو سونی کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کی کوکھ کو کالک لگائی ہے اور کوئی باعزت عورت یہ کالک چھٹائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ تو زندگی کا قانون ہے کہ ہر جان دار اپنی زندگی اور تخلیق کا ثبوت پیش کرنا چاہتا ہے۔ پھر وہ جس کا رواں رواں سراسر تخلیق ہو، اپنے حق

سے باز کیسے رکھی جا سکتی ہے اس لئے وہ چلی گئی۔ کیونکہ اسے اپنی زندگی کا ثبوت پیش کرنا تھا۔ اس میں نہ تمہارا قصور تھا۔ نہ اس کا۔ اس دنیا میں کتنے ہی درد ایسے ہوتے ہیں۔ جن کا الزام کسی کو نہیں دیا جا سکتا۔

" مگر میں اس کے بچوں کو اپنا بیٹا کیسے سمجھ سکتا ہوں۔؟ وہ میرے اپنے بچے نہیں ہیں۔"

" اس دنیا میں کوئی کسی کا اپنا نہیں ہوتا، اپنا بنایا جاتا ہے۔ برش نے جواب دیا اپنائیت ایک رشتہ ہی نہیں، ایک عمل بھی ہے۔

بھاڑ میں جائے تمہارا فلسفہ، میں نے غصے سے جھلاتے ہوئے کہا۔ میں اس کتیا کے پاس نہیں جاؤں گا۔ ہرگز ہرگز اس کے بیٹوں کا باپ نہیں بنوں گا۔

شرم نہیں آتی تمہیں ایسی باتیں کہتے ہوئے۔ مجھے اس بڈھے برش کے سر کا ایک ایک بال غصے سے تنتا معلوم ہوا۔ اگر ایک جنگلی بھیڑیئے کی ماں انسان کے بچے کو اپنا بیٹا بنا سکتی ہے تو تم انسان ہو کر کسی انسان کے بچوں کو اپنا بیٹا نہیں بنا سکتے؟ بس اتنی ہی ہے تمہاری تہذیب۔؟

یکایک میں شرمندہ سا ہو گیا کیونکہ اس کی منطق کے اندر مجھے ایک گہری اور وسیع حقیقت کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ میرا تیز و تند لہجہ خود بخود دھیما پڑ گیا اور آئینے میں دیکھ کر اور احساس ندامت سے مجبور ہو کر میں نے آہستہ سے کہا۔" اچھا اچھا۔ میں اسے کل خط لکھوں گا۔"

" کل پر مت ٹالو۔ کل تک شاید تمہارے خلوص کی گرمی ٹھنڈی ہو جائے۔ ابھی لکھو، اسی وقت۔"

اچھا لکھتا ہوں۔ میں نے آئینے میں اپنی محبوب صورت دیکھتے ہوئے کہا۔

یہ کہہ کر میں خط لکھنے کے لئے پلٹا ہی تھا کہ میرا پاؤں فرش پر پھسل گیا اور شیونگ برش میرے ہاتھ سے چھوٹ کر قریب کی دیوار سے بڑے زور سے ٹکرایا اور پھر فرش پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ میں خود بھی بچتے بچتے دھڑام سے زمین پر گر پڑا اور پھر سنبھل کر گھٹنوں کے بل اٹھتے ہوئے کپڑے جھاڑتے ہوئے جو سیدھا ہوا تو میں نے دیکھا کہ فرش پر میرے شیونگ برش کی لاش پڑی ہے۔ سر کہیں، دھڑ کہیں، پاؤں کہیں اور اس کا چہرہ ایک ایسے بوڑھے آدمی کے کھلے ہوئے منہ کی طرح بھیانک تھا جس کے اندر ایک دانت باقی نہ رہا ہو۔ لکڑی کے ہتھی کے چھوٹے چھوٹے درجنوں ٹکڑے ہو چکے تھے۔ پیتل کا خول ریزہ ریزہ ہوگیا تھا اور شیونگ برش کے چند بال جو اس کے سر پر باقی رہ گئے تھے۔ عجب منتشر شدہ حالات میں فرش پر ادھر ادھر خاک میں بکھرے پڑے تھے۔ یکایک کھڑکی سے ہوا کا ایک جھونکا آیا اور فرش کے گرد و غبار میں اس کے بال اڑا اڑا کر فضا میں بکھرنے لگے۔

تو یہ موت ہے، موت جس کا کوئی آپریشن نہیں ہوتا۔ جس کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔ جو بالآخر کسی طرح بھی نہیں ٹالی جا سکتی۔ میرے سینے سے دبی دبی ایک آہ سی نکلی۔ اس دوست نے اٹھارہ برس تک میرا ساتھ دیا۔ اس نے میری ہر کمینگی برداشت کی اور میرا ہر دکھ جھیلا۔ یہ میرے ساتھ جیل گیا اور اندھی کھولی میں رہا۔ اور جب سب مجھے چھوڑ کر چلے گئے تو یہ میرے ساتھ رہا۔ اس نے ہر مصیبت کا وار ہنس ہنس کر خالی دیا اور جب کسی نے مجھے زخم دیئے، اس نے ایک دردمند مسیحا کی طرح سے اس پر صابن کا نرم نرم جھاگ رکھ دیا۔

غم موت کا نہیں ہے، غم اس جانی پہچانی شکل و صورت کا ہے جو اب کبھی اب دکھائی نہ دے گی۔ غم شخصیت کی اس ادا کا، حسن کی اس ترتیب کا ہے جو آج ہمیشہ کے لئے مٹ گئی۔ غم موت کا نہیں ہے غم اس مخصوص اور مانوس رشتے کا ہے۔ جو آج ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

ڈنڈ باقی آنکھوں سے دیکھتا ہوا ننگے پاؤں سے فرش پر چلتا ہوا میں اس کے قریب پہنچا اور فرش پر بیٹھ کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کے ٹکڑے یوں چننے لگا۔ جیسے کوئی جلی ہوئی چتا سے اپنے کسی پیارے کے پھول چنتا ہے۔

چند دن تک میں نے شیو نہیں کیا۔ یوں ہی داڑھی بڑھائے اِدھر اُدھر ایک عجب بے کلی سے گھومتا رہا۔ چند لوگوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے میرا کوئی قریبی رشتہ دار مر گیا ہو۔ لیکن جب انہوں نے میرے غم کی وجہ پوچھنی چاہی تو میں انہیں کچھ نہ بتا سکا۔ کس سے کہتا کہ میرا شیونگ برش مر گیا۔ اس دنیا میں جہاں آج کوئی ایک انسان کا رشتہ ماننے کو تیار نہیں ہے، ایک انسان کا ایک شیونگ برش سے رشتہ کون تسلیم کرے گا۔؟ مجھے معلوم ہے کہ غریب ماؤں کی کوکھ سے پیدا ہونے والے بیٹے اور کانچ کے دریچوں پر رکھے ہوئے شیونگ برش ہمیشہ بیچے جائیں گے لیکن ان کی روح کا درد کون دیکھے گا۔؟

---

# عقیدت نامے

مستان تلاؤ۔ بھائی ونڈ۔

مورخہ ۱۸ر اپریل ۱۹۵۹ء

میرے کرشن بھگوان! ڈنڈوت پرنام۔!

آپ کو یہ خط پاکر بڑی حیرت ہوگی۔ اچنبا بھی ہوگا۔ یہ کون بے وقوف ہے جو مجھ کو جان پہچان کے بغیر خط لکھ رہا ہے۔ میں ایک عرصہ سے آپ کو خط لکھنا چاہتا تھا۔ مگر ڈرنا بھی تھا۔ کارن یہ کہ میں آپ کا ایک بھگت ہوں، اور بھگت بھی ایسا جس نے آپ کی ساری کتابیں پڑھی ہیں۔ بادن پتّے، گدھے کی سرگزشت، تین غنڈے، مچھلی جال، شکست، شکست کے بعد، سرائے کے باہر، آسمان روشن ہے، صبح ہوتی ہے سب پڑھ چکا ہوں، یقین جانیے، میں تو پڑھ پڑھ کر حیران ہوتا ہوں اور حیران ہو ہو کر پڑھتا ہوں۔

دراصل آپ کے قلم میں جادو ہے جادو! آپ جو لکھتے ہیں، وہ دل میں اُتر جاتا

ہے۔ آپ کا تیکھا طنز، ظالموں پر چوٹ، غریب اور دکھیوں کے ساتھ ایسی ایسی باتیں آپ کی کہانیوں اور ناولوں میں ملتی ہیں کہ کیا بیان کروں اور خوبصورتی کا جو سماں آپ باندھتے ہیں اس سے تو مجھ پر وجد طاری ہونے لگتا ہے۔ چھوٹا منہ اور بڑی بات ہوگی مگر سچ جانیے میں تو اس غریبوں کی دکھی دنیا میں آپ کو اوتار سمان سمجھتا ہوں، دل سے آپ کی پوجا کرتا ہوں۔ آپ بہت ہی بڑے، بہت ہی مہان ادیب ہیں۔ میں ایک غریب ریفیوجی ہوں اور پاکستان سے لٹ لٹا کر ہندوستان میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا ہوں میرا آپ کا کیا مقابلہ۔؟ کہاں راجہ بھوج کہاں گنگو تیلی؟ میں نے تو یہ سوچ کر اتنے دن آپ کو خط نہیں لکھا کہ اس بڑے دربار میں میری رسائی کہاں۔؟ مگر آخر میری شردھا نے مجبور کر دیا کہ میں آپ کی خدمت میں اپنے گل ہائے عقیدت نچھاور کرتا جاؤں۔ اُمید ہے آپ سویکار کریں گے اور مجھے اس خط کا جواب ضرور دیں گے کیونکہ میں آپ کا پروانہ ہوں۔

ادھر بھائی ونڈ میں آپ کی دیا سے اور بھگوان کی کرپا سے میرا کام اچھا چل نکلا ہے بھائی ونڈ میں میری نگینہ بیکری ہے جس کی ڈبل روٹیاں سارے شہر میں مشہور ہیں۔ اگر کبھی آپ ادھر تشریف لائیں تو آپ کو ایسی عمدہ ڈبل روٹیاں کھلاؤں گا کہ آپ کھا کر عش عش کرنے لگیں گے اور بھائی ونڈ بمبئی سے کوئی ایسا دُور بھی نہیں۔ صرف ایک سو یا ڈیڑھ سو میل دُور ہوگا۔ اگر آپ کبھی بھائی ونڈ آئیں تو میں سمجھوں گا کیڑی کے گھر بھگوان آگئے۔ نگینہ بیکری پر میرا چھوٹا بھائی ٹورینڈال بیٹھتا ہے۔ میں اپنی بزازی کی دوکان "بالے دی ہٹی" پر بیٹھتا ہوں میری "بالے دی ہٹی" بھائی ونڈ میں کپڑوں کی سب سے بڑی دوکان ہے۔ میں آپ کی خدمت میں الگ پارسل سے گرم سوٹ کا تین گز کا ٹکڑا بھیجتا ہوں۔ اس کو ایک غریب مگر اپنے بھگت کا حقیر تحفہ سمجھ کر سویکار کریں اور رسید سے فوراً مطلع کریں۔ وہ دن، میری زندگی کا سب سے

خوش قسمت دن ہوگا جس دن میرے بھگوان میری سُنیں گے اور اپنے ہاتھ سے مجھے خط لکھ کر میرا جیون کرتارتھ کریں گے۔ میں ہر روز آپ کے خط کی آشا کرتا رہوں گا۔

آپ کا بھگت

گھسیٹا رام پروانہ

---

مستان تلاؤ۔ بھائی ونڈ

مورخہ ۲۰ر مئی ۱۹۵۹ء

میرے اچھے اور عظیم ادیب کرشن جی مہاراج! نمستے، اور بندے ماترم کے بعد معلوم ہو کہ عرصۂ دراز سے آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔ وجہ نامعلوم؟ میں نے ایک خط آپ کو ۱۸ر اپریل کو لکھا تھا جس کا ابھی تک جواب نہیں آیا ہے۔ ایک ٹکڑا گرم سوٹ کا بھی بھیجا تھا۔ جس کی رسید آپ کے دستخط والی مل گئی ہے۔

رسید پر آپ کا نام دیکھ کر میں نے اُسے ماتھے سے لگا لیا، اور اپنے من میں کہا کہ یہ "مہان ادیب کے دستخط ہیں جس کے ایک ایک حرف سے لاکھوں لوگوں کو زندگی کا سچا سبق ملتا ہے۔ جو لوگوں کے فائدے اور ان کی بھلائی کے لئے لکھتا ہے۔ جس کے بھگت سینکڑوں ہزاروں ہندوستان، افغانستان، ایشیا اور روس اور یورپ میں پائے جاتے ہیں۔

کرشن جی جو غریبوں کا دیوانہ ہے۔ جس کا چاہنے والا گھسیٹا رام پروانہ! مگر آپ کا خط نہیں آیا۔ وجہ نامعلوم؟ میں نے نگینہ بیکری میں بھائی لوریندا مل سے بھی پوچھا تھا۔ مگر آپ کا پتر ان کی دوکان پر بھی نہیں آیا۔ وجہ نامعلوم؟ آپ ضرور میرے خط کا جواب دیں۔ میں نے بڑی آرزوؤں سے آپ کو خط لکھا ہے۔ میں نے آپ کی سب کتابیں پڑھی ہیں۔ ایک کتاب نہیں

چھوڑی۔ سب کی سب اپنی الماری میں بند کر کے رکھتا ہوں۔ کسی کو آپ کی کتاب پڑھنے کے لئے نہیں دیتا۔ اپنی بیوی کو بھی نہیں دیتا۔ مجھ کو معلوم ہے۔ آپ بہت بڑے آدمی ہیں۔ لیکن کیا ہوا آپ کو ہم غریبوں کا بھی خیال کرنا چاہیئے۔ کبھی دل میں سوچتا ہوں، بھگوان نہ کرے آپ بیمار ہوں گے یا کسی تکلیف کے چکر میں پھنس گئے ہوں گے، لیکن ایسا نہیں ہو سکتا۔ آپ تو سب کا بھلا چاہتے ہیں۔ آپ کو بھگوان کبھی تکلیف نہیں دے سکتا۔ آپ نے اب تک میرے خط کا جواب نہیں دیا۔ وجہ نہ معلوم؟ لہذا اس خط کا جواب ضرور دینا۔ واپسی جواب کے لئے ٹکٹ ارسال کر رہا ہوں۔

آپ کا اپنا۔ گھسیٹا رام پروانہ

---

مستان تلاؤ۔ بھائی وندر۔

مورخہ ۲ر جولائی ۱۹۵۹ء

کرشن جی!

دو خط آپ کی سیوا میں بھیج چکا ہوں۔ ایک کا بھی جواب نہیں۔ وجہ نا معلوم؟ یقین جانیے سچ بولتا ہوں۔ مجھے آپ سے اس سلوک کی توقع نہ تھی۔ میں نے تو اپنے من مندر میں آپ کی جو تصویر بنا رکھی تھی اس کو آپ نے اپنے طرز عمل سے چکنا چور کر کے خاک کر دیا ہے ایسا بھی کیا۔ آخر ہم بھی انسان ہیں۔ آپ کی طرح دل رکھتے ہیں۔ کسی کے دل کو دکھانا اچھا نہیں ہوتا۔ جو گھر پر آجائے اس کو مٹانا اچھا نہیں ہوتا۔ لیکن اب بھی مجھے آپ کے کرم سے امید ہے کہ آپ مجھے ضرور جواب دیں گے، ضرور خط لکھیں گے۔ مجھے نا امید اور نراش نہیں کریں گے۔ آپ سے ایک نویدن ہے۔ اگر آپ اب خط لکھیں تو نگینہ بکیری کے پتے پر نہ لکھیں۔

کیونکہ میں نے اپنے بھائی لوریندا مل کو وہاں سے ہٹا دیا ہے۔ ہٹا کیا دیا ہے وہ بدمعاش خود ہٹ گیا ہے وہ ہماری بیکری کے تنور میں ڈبل روٹیاں پکانے والی لڑکی کو لے کر کہیں فرار ہو گیا ہے اور دوکان کے تین سو روپے بھی لے کر چلا گیا ہے۔ بولئے کیسا زمانہ آیا ہے؟ بھائی بھائی کا نہیں رہا۔ خون خون سے الگ ہو گیا۔ جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔ کیا عرض کروں بہت دُکھی ہوں۔ ہر روز آپ کی کتابیں پڑھتا ہوں اور ہر روز آپ کے خط کا انتظار کرتا ہوں۔ دو سطروں کا ایک مختصر خط ہی لکھ دیں۔ آپ کے لکھے ہوئے دو حروف بھی مجھ کو مل جائیں گے تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت خیال کروں گا۔ اُمید کرتا ہوں کہ آپ یہ خط ملتے ہی واپسی ڈاک سے مجھے جواب دیں گے۔

آپ کا۔ گھسیٹا رام پروانہ

---

مستان تلاؤ۔ بھائی ونڈ

مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۵۹ء

کرشن صاحب!

کیا بات ہے میرے کسی خط کا جواب نہیں آتا۔؟ میں نے جناب خوشتر گرامی ایڈیٹر "بیسوی صدی" سے آپ کا پتہ منگایا تھا۔ اس لئے پتہ غلط نہیں ہو سکتا۔ پھر کیا بات ہے وجہ نامعلوم۔؟ میں ہر روز آپ کے خط کا انتظار کرتا ہوں، اور شعر پڑھتا ہوں۔

خط کبوتر کس طرح لے جائے بامِ یار پر
پر کترنے کو لگی ہیں قینچیاں دیوار پر

سچ کہتا ہوں اگر میں کبوتر ہوتا تو خط لکھنے کی بجائے خود اپنا سندیسہ لے کر آپ کی

خدمت میں حاضر ہوتا۔ لیکن قسمت کی بات ہے۔ میں اِدھر اپنے کام میں اتنا جکڑا ہوا ہوں کہ بھائی ونڈ سے باہر نہیں نکل سکتا۔

میری بیوی کی پیٹھ پر خارش ہو گئی ہے اور میرا سب سے چھوٹا بیٹا گھگو جس کو ہم پیار سے گھجا بھی کہتے ہیں آج کل دانت نکال رہا ہے۔ پھر میری کپڑوں کی دوکان پر جو سیلز مین کام کرتا تھا وہ پالین کے دو تھان چُرا کر فرار ہو گیا ہے۔ آپ غریب آدمی کی طرفداری تو کرتے ہیں لیکن جب غریب آدمی چوری کرتا ہے تو اس کو کچھ نہیں کہتے۔؟ کیا اسی کا نام ترقی پسندی ہے۔؟ اُدھر انکم ٹیکس والوں نے بھی مجھ کو بہت ستا رکھا ہے۔ آپ انکم ٹیکس والوں کی بے رحمی پر ایک افسانہ کیوں نہیں لکھتے۔؟ میری ایک تمنا بہت دنوں سے تھی کہ میں اپنی ایک تصویر آپ کے ساتھ کھنچاؤں مگر مجھ کو بھائی ونڈ کے کام سے اتنی فرصت نہیں ملتی۔ اگر آپ کبھی ادھر آئیں تو میں آپ کو آنے جانے کا تھرڈ کلاس کا کرایہ دے دوں گا۔ آپ وہی سوٹ پہن کر آئیں جس کا کپڑا میں نے آپ کو پہلے خط کے ساتھ بھیجا تھا۔ دیکھئے آپ میری تمنا کب پوری کرتے ہیں۔ پہلے ایک خط کی آس پوری کر دیں۔ کب سے آنکھیں بچھائے بیٹھا ہوں۔

فقط

آپ کا۔ گھسیٹا رام پروانہ

---

مستان تلاؤ۔ بھائی ونڈ

مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۵۹ء

ابے او کرشن کے بچے!

تو کیا سمجھتا ہے۔ اپنے آپ کو۔؟ تجھ کو پہلا خط ۱۸ اپریل کو لکھا۔ دوسرا خط

۲۰ مئی کو لکھا۔ تیسرا خط رجسٹری سے ۲ر جولائی کو روانہ کیا۔ چوتھا خط ۱۰ر اگست کو لکھا۔ مگر تو نے کسی خط کا جواب تک نہ دیا۔ کیا انسانیت اسی کو کہتے ہیں۔ کیا کسی کا نام شرافت ہے کیا بڑا ادیب وہی ہوتا ہے جو اپنی ہستی پر اس قدر مغرور ہو جائے کہ کسی کو کبھی اُس کے خط کا جواب نہ دے۔

تجھ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اگر تو بڑا ادیب ہے تو اپنے گھر کا ہوگا۔ ہم بھی کچھ کم نہیں ہیں چشمِ ما روشن دلِ ما شاد ہم بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ ادھر بھائی ذنڈ میں میری نگینہ بیکری ہے۔ بالے دی ہٹی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں میں نے اینٹوں کا بھٹہ بھی چالو کر دیا ہے اور اب پل کے ٹھیکے کے لئے ٹینڈر بھر رہا ہوں۔ تو اپنے آپ کو ایشیا کا عظیم ادیب لکھواتا ہے۔ خوشتر گرامی تمہارا پراپیگنڈا کرتا ہے۔ ابے تیرے ادیب کی ساری ایشیائی کھول کر رکھ دوں گا۔ کیا سمجھتا ہے تیرے ایسے ایسے دس ادیب اور رائٹر میں اپنے پیشاب کی دھار میں بہا سکتا ہوں۔ سالے دلّے دلّے پتر..... تیری..... لوں..... نکال میرے سوٹ کا کپڑا! کدھر ہے وہ گرم کپڑے کا ٹکڑا جو میں نے تجھے پہلے خط کے ساتھ بھیجا تھا۔ نہیں تو میں خود بمبئی آ کر تیرا مزاج ٹھیک کرتا ہوں۔!

بقلم خود۔ گھسیٹا رام

# مونگ کی دال

پیارے بونگا بھائی جی! (نمستے) بندے ماترم

بونگا ناؤ صوبہ میں کانگریس منسٹری کو جمانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ کیونکہ صوبائی اسمبلی میں ہر ممبر کی اپنی ایک پارٹی تھی اور مجھے ہر وقت یہ ڈر رہتا تھا کہ کہیں اسمبلی کے ممبروں کی اکثریت ہمارے کیبنٹ کو دھوکا نہ دے دے۔ ایسی حالت میں دیکھتے ہوئے مجھے مندرجہ ذیل کام کرنے پڑے وہ بھی اس بات کو سامنے رکھ کر جب تک صوبہ میں کانگریس منسٹری مضبوط نہیں ہو جاتی ہمارے صوبہ میں بونگا راج قائم نہیں ہو سکتا۔

بندے ماترم

کیبنٹ بناتے ہی سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ اپنے علاوہ اسمبلی کے تمام ممبروں کو اپنے دشمنوں کی لسٹ میں درج کر لیا (ہماری اسمبلی میں انچاس ممبر تھے) پھر میں نے اس لسٹ سے دس ایسے ممبر چھانٹ لئے جو ہر موقعہ پر میری مخالفت کرتے تھے۔ ان کو میں نے منسٹر چن لیا۔ یہ لوگ اس سے پہلے میرے کٹر مخالف تھے اب میرے

سب سے اچھے دوست ہیں اور کانگریس منسٹری کے سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ممبر سمجھے جاتے ہیں۔

انچاس میں سے دس گئے۔ بچے انتالیس۔ ان میں سے میں نے دس ممبروں کو منسٹروں کے لئے پارلیمنٹری سکرٹری چن لیا۔ بچے انتیس۔ ان میں سے میں نے اپنے لئے چار کو پارلیمنٹری سکرٹری چن لیا۔ کیونکہ اتری، دکھنی، پوربی اور پچھمی بولنگا ناؤ صوبہ کا وزیر اعلیٰ ہوتے ہوئے میں اس کی چاروں کھونٹو کا خیال نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے میں نے :-

۱۔ کرنل ہرجاب سنگھ کو اتری پارلیمنٹری سکرٹری بنایا۔

۲۔ چودھری چوہارام کو دکھنی سکرٹری کے عہدہ پر مامور کیا۔

۳۔ ملک گھسیٹا مل کو پوربی سکرٹری چنا اور

۴۔ کپتان خوش وقت رائے کو پچھمی سکرٹری کے عہدہ پر بٹھایا۔

اس طرح لگ بھگ آدھے ممبروں کو اسمبلی ہی میں سے سرکاری عہدے دے دیئے۔ اس کے بعد میرا کام بہت آسان ہو گیا۔ ایک اسمبلی ممبر کو میں نے چیف وھپ بنا دیا۔ دوسرے کو اس کا اسسٹنٹ اور تیسرے کو اسسٹنٹ کا اسسٹنٹ۔ بندرا کار ایم۔ ایل۔ اے مجھے بہت پریشان کیا کرتا تھا۔ میں نے اسے پبلسٹی بورڈ کا چیئرمین بنا دیا۔ سردار کھوکا سنگھ اور سردار ڈھوڈیا کسی طرح راضی نہ ہو سکے۔ اس لئے انہیں کمیونسٹ سمجھ کر گرفتار کر لیا۔ وہ دونوں آجکل پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت جیل میں بند ہیں۔ یہ انگریزوں کے وقت کے پرانے قانون اس وقت بہت کام آ رہے ہیں۔ حقیقتاً آج پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں کا طریقہ کتنا اچھا ہے۔

اس طرح سے اسمبلی کے اکتیس ممبر کام پر لگ گئے۔ اب اسمبلی میں میری اکثریت تھی۔ لیکن پھر بھی مخالف گروہ میں اٹھارہ ممبر رہ گئے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ آج کل جمہوریت کے برے زمانے میں یہ اٹھارہ ممبر بھی بہت شور مچا سکتے ہیں۔ میں چاہتا تو ان میں سے آٹھ دس کو اور منتری بنا سکتا تھا۔ سب کے سب منتری بن جائیں تو اسمبلی کا کام کیسے چلے گا؟ پھر اخبار بھی شور مچائیں گے۔ اس لئے میں بہت فکر مند تھا اور سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں کو کیسے راضی کروں۔ اتنے میں مخالف گروہ کے ایک ممتاز رکن نے کسی معمولی بات پر بھوک ہڑتال شروع کر دی اور مجھ پر دباؤ ڈالنے لگا لیکن میں کہاں دینے والا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ آجکل ہر طرح کی ہڑتالیں غیر قانونی قرار دی جا چکی ہیں۔ تم بھوک ہڑتال بھی نہیں کر سکتے۔ پھر اس طرح کا دباؤ ڈالنا سچائی اور اہنسا کے خلاف ہے۔ پھر اب بھوک ہڑتال کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کانگریس نے بونگا راج قائم کر کے بونگا کی تاریخ میں ایک ایسی مثال پیش کر دی ہے جو جب تک دنیا رہے گی جگمگاتا رہے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

بہت ساری باتیں میں نے اس سے کہیں لیکن وہ کم بخت نہیں مانا۔ اپنی بھوک ہڑتال پر ڈٹا رہا۔ آخر میں نے ایک دن اسے الگ لے جا کر کہا کہ تمہیں درحقیقت بھوک ہڑتال کی ضرورت نہیں ہے۔ ضرورت تمہیں اس بات کی ہے کہ تمہارے پاس ایک شاندار پرمٹ ہو۔ جس کے ذریعہ تم ولایت سے بیوک گاڑیاں یہاں منگا سکو۔ میرا یہ اعلان سنتے ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا اور اس نے اسی وقت "بیئر" کا ایک گلاس منگوا کر اپنی بھوک ہڑتال توڑ دی۔

اس سے مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پرمٹ میں کتنی طاقت ہے اور زور ہے۔

اپنی بات منوانے کا۔ اس دن سے ہی میں اپنی داہنی جیب میں پرمٹ اور بائیں جیب میں باقی سب ممبروں کو رکھتا ہوں۔ (صرف ان دو بدمعاشوں کمیونسٹوں کو چھوڑ کر جو جیل میں ہیں) اور اب وزارت کا کام بڑے مزے میں چلتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اب ہماری اسمبلی میں کوئی مخالف جماعت ہی نہیں ہے اور بونگا راج میں مخالف جماعت کی ضرورت بھی کیا ہے۔؟

اب میں آپ سے یہی استدعا کرتا ہوں کہ اگر آپ آنے والے چناؤ کے وقت میرے آدمیوں کو بونگا ٹکٹ دے دیں تو وہ لوگ ہمیشہ آپ کے مشکور ہوں گے۔ آخر میں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ کچھ بدمعاش کانگریس والوں نے مجھے عاشق کہہ کر آپ کے کان بھر دیے ہیں۔ رتی بھر بھی عاشق نہیں ہوں۔ پچھلے بارہ سال سے میں اپنی بیوی کے ساتھ بھی اپنی ماں اور بہن جیسا سلوک کر رہا ہوں اور یہ کانگریس کے سچے اصول کے مطابق ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے سادھو کا روپ دھار لیا ہے۔ آج کل میں صرف مونگ کی دال کھاتا ہوں اور نیرا پیتا ہوں۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ میں عاشق ہوں انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہماری اسمبلی میں کوئی عورت ممبر نہیں ہے۔ پھر مجھ پر عاشقی کا الزام کیوں کر لگایا جا سکتا ہے۔؟

پیارے بونگا بھائی مجھے آپ سے امید ہے کہ آپ ان دشمنوں کی باتوں میں نہیں آئیں گے۔ یہ لوگ تو آپ کے اور میرے درمیان ایک دشمنی کی کھائی کھودنے پر تلے ہوئے ہیں۔

اور میں اپنے اس خط کو ایک خاص بات کے ساتھ ختم کرتا ہوں۔ آپ سنکر یقیناً خوش ہوں گے کہ اگرچہ میں وکالت کے امتحان میں پانچ بار فیل ہو چکا ہوں لیکن

اب بونگستان یونیورسٹی نے اس برس کا نوویکشن کے موقع پر مجھے ایل۔ ایل۔ ڈی یعنی وکالت کی سب سے بڑی ڈگری عطا کی ہے۔ ہاہاہا۔ میرا دل قہقہے لگانے کو چاہتا ہے۔ وقت کا پھیر دیکھیئے اس یونیورسٹی نے مجھے وکالت کے امتحان میں پانچ مرتبہ فیل کیا اور اب ہاہا۔

آپ کا..... بہت بہت چاہنے والا

بونگا چند

---

پیارے بونگا چند نمستے۔

تمہارا خط پڑھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ جس کوشش سے تم نے اپنے لئے کانگریس منسٹری میں جگہ حاصل کی ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ حضور مہاراج کی موت کے بعد ان کی آتما ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔ مجھے تم پر پورا پورا بھروسہ ہے اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ الیکشن میں تمہاری ہر طرح سے پوری پوری مدد کروں گا۔ اور تمہیں کو مشرق، مغرب، جنوب، شمال (کوئی سمت رہ گئی ہو تو شامل کرلیں۔) بونگا ضلع کا وزیر اعظم بنا دیا جائے گا۔

لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تم نے منسٹری بناتے وقت "بگلے" کو کیوں نظر انداز کر دیا۔ میں جانتا ہوں کہ بگلا ایک بہت ہی بے وقوف اور نالائق آدمی ہے۔ لیکن آج کل کے اصول کے مطابق وہ ہمارے بڑے کام کا آدمی نکل سکتا ہے۔ تمہارے ضلع میں اس کا کافی زور ہے اور میرا خیال ہے کہ تم بگلے کو وزیر بنالو اور اس کے مخالفوں کو دو چار سکریٹری کے عہدے دیدو۔ پھر اس ضلع میں ہمیں

کوئی نہیں ہرا سکتا۔ اس بات کو کبھی نہ بھولو کہ پھر بھی ہمارے دشمنوں کے باوجود عام الیکشن ہوگا اس وقت ہمیں لبگلا بھگتوں کی سخت ضرورت ہوگی۔

میں تمہارے اس کام سے بالکل مطمئن نہیں ہوں جو تم نے رلفیوجی لوگوں کے لئے کیا ہے۔ اس کے علاوہ تمہارے ضلع میں اناج کا کال ہے۔ کھانے پینے کی چیزیں مہنگی ہیں۔ اس بارے میں اپنی مکمل رپورٹ فوری بھیجواؤ اور مونگ کی دال کا کھانا فوری بند کرو۔ مونگ کی دال کھانا اور تیسرے درجہ میں سفر کرنا اس وقت اچھا معلوم ہوتا ہے جب شری حضور مہاراج زندہ تھے اور پھر تم جس منزل پر ہو اس پر پہنچ کر مونگ کی دال کھانا سرکاری رعب و دبدبہ کے اصول کے خلاف ہے اس عادت کو چھوڑنے کی کوشش کرو۔

تمہارا بولنگا بھائی۔

---

بزرگوار بولنگا بھائی۔ آداب!

آپ کا خط مجھے ملا۔ میں نے جانچ پڑتال کر کے مندرجہ ذیل کام پورے کر لئے ہیں۔

۱۔ میں نے لبگلا بھگتوں میں سے ایک کو وزیر بنا لیا ہے۔ لیکن اس کے پاس کوئی عہدہ نہیں ہوگا۔ کیبنٹ میں اس کے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی اور اسمبلی میں کوئی سیٹ نہیں ہوگی۔ کیونکہ وہ اس قابل نہیں ہے۔ لبگلے نے اپنی طرف سے یہ یقین دلایا ہے کہ وہ ہمیشہ خاموش رہے گا اور ہندوؤں کو ہریجن کے برابر سمجھے گا۔ اس سے آپ سمجھ جائیں گے کہ لبگلے نے کہاں تک اپنی عقل کو استعمال کیا ہے۔

۲۔ لیکن بگل بھگتوں کو پارلیمنٹ سکریٹری چننا بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ میں انہیں پارلیمنٹری سکریٹری بنا سکتا ہوں۔ یا انہیں وزیر بنا کر خاموش کارروائیوں کے لئے رکھ سکتا ہوں۔ لیکن اصل سوال یہ ہے کہ بگلا بھگت پارلیمنٹ کے ممبر نہیں ہیں۔ اس لئے مزید وزیر بنانے کیلئے یہ ضروری ہے کہ اسمبلی کے قانون میں ترمیم کی جائے۔

۳۔ ہمارے ملک میں اب ریفیوجی نام کی چیز نہیں ہے۔ میں نے اپنے وزیر بحالیات سے اچھی طرح جانچ پڑتال کر لی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اب ہمارے علاقے میں کوئی شرنارتھی نہیں ہے۔ اس سے پہلے شرنارتھیوں کا مسئلہ بہت ہی نازک معاملہ اختیار کر چکا تھا۔ پھر میں نے وزیر بحالیات کو جو خود شرنارتھی ہیں۔ وزیر بحالیات بنا دیا اور اب اس مشکل پر قابو پا لیا ہے۔ نہ صرف یہاں شرنارتھی ہیں۔ بلکہ ریفیوجی بھی نہیں ہیں اور جو شرنارتھی تھے وہ سب یا تو کیمپوں میں بسا دیئے گئے یا جیلوں میں آباد کر دیئے گئے ہیں اور جو کچھ گنے چنے عزت دار شرنارتھی رہ گئے ہیں انہیں زمین، پرمٹ، ٹھیکہ وغیرہ دے کر بسا دیا گیا ہے۔ اب میں ریفیوجی کا نام سننے کو بھی تیار نہیں ہوں۔ ہاں اگر آپ کا اصرار ہے تو بات دوسری ہے۔

۴۔ جہاں تک چیزوں کی مہنگائی کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ اس طرف دھیان ہی نہ دیا جائے اور آپ سے بھی میری درخواست ہے کہ آپ مہنگائی کی طرف ذرا سی بھی توجہ نہ دیں۔ ایسا سمجھ لیں کہ گویا مہنگائی ہے ہی نہیں۔ اس سے ساری مشکلیں خود بخود حل ہو جائیں گی۔ کیونکہ جب آپ مہنگائی کا تصور ہی نہیں کرتے تو پھر بلیک مارکیٹ کی پریشانی بھی باقی نہیں رہتی۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ آج کل بلیک مارکیٹ کو قانونی طور پر جائز قرار دے دینا چاہیئے۔ بلیک مارکیٹ کا

قانونا جائز اور سفید بازار کو قانونا جائز (لازمی) قرار دینا چاہیئے اور جو آدمی یا دوکاندار چیزیں سستی فروخت کریں انہیں کوڑوں کی سزا دی جانی چاہیئے۔ اگر آپ اس پر عمل کریں گے تو تھوڑے ہی دنوں میں آپ مہنگائی کا نام بھی نہ سن سکیں گے۔ عوام غم میں گھل کر آلو کی طرح پچک جائیں گے اور اس کا جو نتیجہ ظاہر ہوگا اس سے مکانوں کی مشکل بھی حل ہو جائے گی۔ زیادہ کھلی ہوا اور زیادہ کھلی جگہ سب کو مل جائے گی اور ہمارا ایک قدم اور آگے بڑھے گا۔

۵۔ آخر میں تیسرے درجہ میں سفر کرنے کا سوال ہے۔ مجھے اس سے انتہائی دکھ پہنچے گا۔ لیکن آپ اگر کہتے تو میں آج سے ریل کے تیسرے درجہ میں سفر کرنا بند کرتا ہوں اور عہد کرتا ہوں کہ آج سے کبھی ہوائی جہاز، فرسٹ کلاس یا اسٹرکنڈیشنڈ سے کم میں کبھی سفر نہیں کروں گا۔ (اس وقت میری آنکھیں بھر آئی ہیں) کیونکہ میری نظر میں مرحوم مہاراجہ کا چہرہ گھوم رہا ہے۔ جنہوں نے ہمیں بونگ راج دیا لیکن جن کے میموریل فنڈ کی رقم ابھی تک پوری نہیں ہوئی۔ لیکن بونگا بھائی میں مونگ کی دال کھانا کیسے بند کر سکتا ہوں؟ میں کانگریس ہائی کمانڈ کا حکم نہیں ٹال سکتا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں کیا کھاتا ہوں، کیا پہنتا ہوں اس پر کانگریس ہائی کمانڈ کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ میرا اپنا نجی معاملہ ہے۔ چاہے میں مونگ کی دال کھاؤں یا چنے کی یہ تو ہمارے منہ پر اتنا زبردست طمانچہ ہے جسے میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لئے میں برابر مونگ کی دال کھاتا رہوں گا۔

آپ کا بہت بہت..... بونگا چند

(ارجنٹ ٹیلی گرام (بونگا بھائی سے بونگا چند کو)

مونگ کی دال کھانا فوری بند کردو ورنہ استعفےٰ پیش کردو۔

بونگا بھائی

ارجنٹ ٹیلی گرام جواب

خدا کے لئے اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کریں۔ مونگ کی دال بالکل سادی سی غذا ہے۔ سٹاپ! مونگ کی دال کی کوئی سیاسی اہمیت نہیں ہے۔ سٹاپ! مونگ کی دال کو حضور مہاراج بھی پسند کرتے تھے۔ سٹاپ! دیکھئے مرحوم مہاراجہ کی کتاب میں اور مونگ کی دال صفحہ ۴۲۰۔

بونگا چند

جوابی تار

کانگریس ہائی کمان کا متفقہ فیصلہ ہے کہ مونگ کی دال کھانا بند کردو ورنہ الگ ہو جاؤ۔

بونگا بھائی

جوابی تار

مونگ کی دال بند کردی ہے سٹاپ پیش ہوگئی ہے سٹاپ مبارکباد دیجئے۔

بونگا چند

اخبار کی سرخی

اسٹاپ پریس۔ بونگا پور۔ خبر ملی ہے کہ جناب بونگا بھائی اور بونگا چند کے درمیان جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی تھیں اب وہ دور ہوگئی ہیں۔ اس لئے مشرق، مغرب، جنوب، شمال صوبوں کی وزارت میں فی الحال کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔

---

# ہندی کا نیا قاعدہ

## ( بڑی عمر کے بچوں کے لئے )

( अ ) ا سے امن

بچو! یہ امن کا وقت ہے۔ جس طرح " ا " اس پرائمر کا پہلا لفظ ہے۔ اسی طرح امن بھی ہماری زندگی کا پہلا لفظ ہے۔ ہمارے سماج کا پہلا اصول۔ امن ہمیشہ دو لڑائیوں کے درمیانی وقفہ کو کہتے ہیں۔ پہلے لڑائی ہوتی ہے۔ پھر امن اس کے بعد پھر لڑائی ہوتی ہے اور اگر لڑائی نہیں ہوتی ہے تو لڑائی کی تیاری ہوتی ہے۔ ابھی تھوڑے سال ہوئے لڑائی ختم ہو چکی ہے۔ دشمن ہار گئے اور امن کا زمانہ آیا۔ امن ہمیشہ دشمن کی ہار کے بعد آتا ہے۔ یاد رکھو امن کے بعد لڑائی ہوتی ہے۔ آج کل لڑائی کی تیاری ہو رہی ہے امن کے لئے کاغذ کے ایک پرزے کی ضرورت ہوتی ہے اور لڑائی کیلئے آدمی کے خون کی۔

اب ہماری دنیا کے بڑے بڑے سائنسداں جنہوں نے گیس، ٹینک، توپ، ایٹم بم اور لڑائی کے دوسرے ہتھیار بنائے ہیں اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ لڑائی کی تیاری

کا زمانہ بہت کم ہو جائے اور ہم آسانی سے ایک لڑائی سے نکل کر دوسری لڑائی میں شامل ہو سکیں۔ لڑائی اس لئے لڑی جاتی ہے کہ دنیا میں امن قائم ہو۔ کیونکہ اگر امن کے بعد امن نہ ہو تو لڑائی ہوئے کیوں؟ اس لئے دنیا میں امن لڑائی سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ لڑائی اس لئے کی جاتی ہے کہ دنیا میں امن رہے اور امن کی مانگ بھی اس لئے کی جاتی ہے کہ لڑائی کی تیاری اچھی طرح کی جا سکے۔ ہر اگلی لڑائی پچھلے امن کی شرطوں پر پیدا ہوتی ہے۔ امن لڑائی کو پیدا کرتا ہے، جس طرح ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔

## (ग्रंथ) آ۔ آتما (روح)

بچو! آتما یا روح اس کانٹے کو کہتے ہیں جو انسان میں چبھ کر اسے ہمیشہ تکلیف دیتا ہے۔ کھیلتے ہوئے تمہارے پاؤں میں کئی بار کانٹا چبھا ہوگا اور تم نے محسوس کیا ہوگا کہ جب تم چلتے ہو تو کانٹا تمہیں تکلیف دیتا ہے اور اگر نہ چلو اور پاؤں کو ہوا میں لٹکا رکھو تو یہ کانٹا کوئی تکلیف نہیں دیتا۔ بس یہی حال آتما کا ہے۔ روح بھی آدمی کو اسی وقت پریشان کرتی ہے جب وہ کوئی کام کرنے لگے۔ ہلے جلے یا کوئی حرکت کرے۔ ہاں اگر انسان ہوا میں لٹکا رہے تو وہ پریشان نہیں ہوتا اسے کسی طرح کا دکھ نہیں ستاتا۔

پچھلے زمانے میں انسان کو اس کی روح بہت پریشان کرتی تھی اور ہزار بار نکالنے کے باوجود بھی یہ کانٹا نہیں نکلتا تھا۔ لیکن آج کل کے زمانے میں سائنس نے اتنی ترقی کی ہے کہ اب روح کا آپریشن ہو سکتا ہے۔ اس نے اب اپنڈے سائٹس کی فالتو آنت کی طرح روح کا کانٹا بھی آپریشن کے ذریعہ انسان کے اندر سے نکال دیا جاتا ہے۔ آج کل

تمہیں سو میں سے ننانوے آدمی ایسے ملیں گے جن کے اندر روح نہیں ہے۔ میں نے بھی کافی دن ہوئے یہ آپریشن کرالیا تھا۔ اب مجھے کسی طرح کی کوئی پریشانی نہیں ہے۔ بچو۔ تم بڑے ہوگے تو تمہاری روح کا بھی آپریشن کیا جائے گا۔ چھوٹی عمر کے بچوں پر یہ آپریشن نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہو آ سے آتما۔!

(S) ای۔ انسان

بچو! ہم سب انسان ہیں۔ انسانوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ چھوٹے انسان اور بڑے انسان۔ چھوٹے وہ ہوتے ہیں جو چکی چلاتے ہیں، کھیتی باڑی کرتے ہیں، ریل گاڑیاں چلاتے ہیں اور زمین کے اندر گھس کر کوئلہ، نمک، سونا، چاندی، لوہا نکالتے ہیں۔ یہ سب چھوٹے انسان کہلاتے ہیں۔

دوسری قسم بڑے انسانوں کی ہے۔ بڑے انسان وہ ہوتے ہیں جو چھوٹے انسانوں کو انسان نہ سمجھیں۔

انسان کی ایک تعریف یہ ہے کہ وہ اشرف المخلوقات ہے۔ سارے جانوروں سے اچھا جانور انسان ہے اور سارے انسانوں میں سے اچھے انسان انگلینڈ کے رہنے والے ہیں۔ انگلینڈ بھی ای (S) سے بنتا ہے اس لئے وہاں کے رہنے والے بھی انسان ہیں۔ اگرچہ کچھ لوگ انہیں ایشور (اللہ) سمجھتے ہیں۔

بچو! انگریز تم نے اکثر دیکھا ہوگا۔ انگریز کی چمڑی سفید ہوتی ہے۔ تمہارا رنگ کالا ہے۔ بھورا ہے، گیہواں ہے۔ لیکن سفید نہیں۔ سفید رنگ امریکیوں کا بھی ہوتا ہے انگریز اور امریکی بھائی بھائی ہے اور دنیا کے رنگ دار چمڑی والوں کو چھوٹے انسان

سمجھنے کا ان کو حق ہے۔

ای سے اتفاق بھی بنتا ہے۔ لیکن چونکہ ہندوستان میں یہ نہیں ہوتا، اس لئے اس قاعدے میں اس کا ذکر نہیں آئے گا۔ بچو! موجودہ زمانہ میں۔ انسانوں کی اس دنیا میں۔ اپنی ہنسی کو یاد رکھو اور کہو ای۔ انسان!

---

(ج) ای۔ ایمانداری۔

بچو! ایمانداری اور سچائی انسانوں کی سب سے بڑی اچھائی ہے۔ تم نے جارج واشنگٹن کی کہانی ضرور سنی ہوگی۔ جس نے اپنے بچپن کے دنوں میں کلہاڑی سے اپنے باپ کا ایک پیڑ کاٹ ڈالا تھا۔ جب اس کے باپ نے اس سے ڈانٹ کر پوچھا کہ یہ پیڑ کس نے کاٹا ہے تو اس نے ایمانداری اور سچائی سے اقرار کر لیا کہتے ہیں۔ اس پر اس کا باپ بہت خوش ہوا اور اس نے پیشین گوئی کہ جارج آگے چل کر بہت بڑا آدمی بنے گا۔ ہوا بھی یہی۔ ایمانداری برتے برتے جارج واشنگٹن ایک دن امریکہ کا صدر بن گیا۔

اس واقعہ کے بعد دنیا کے ہر بڑے آدمی نے یہ اصول اپنا لیا کہ وہ بچپن سے ہی ایمانداری سیکھ لیتا ہے اور پیڑ کاٹنا شروع کر دیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ قیصر ولیم پیڑ کاٹنے کا بہت شائق تھا۔ مشکل یہ تھی کہ اس کو کاٹنے والا کوئی نہ تھا۔ اس لئے اسے ایمانداری دکھانے کا کوئی موقعہ نہ تھا اور وہ پچھلی عالمی جنگ ہار گیا اور سنا ہے کہ انگلینڈ کے وزیر اعظم مسٹر چرچل بھی سچ بولنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے بچپن میں اتنے پیڑ کاٹے کہ کئی جنگل کے جنگل ہی اجاڑ دیئے۔ اس طرح یورپ کے ایک بہت بڑے آدمی کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے سچ بولنے کی خاطر

درخت کے علاوہ ایک آدمی کا گلا بھی کاٹ ڈالا تھا اور اس کے باپ نے خوش ہو کر اس کو اسی وقت معاف کر دیا تھا۔

میں نے یہ کہانیاں تیسری کلاس میں پڑھی تھیں۔ ان دنوں مجھے بھی ایمانداری دکھانے کا شوق چرایا۔ اس لئے ایک دن موقعہ پا کر میں نے کلہاڑی ہاتھ میں لی اور اپنے گھر کے آس پاس جتنے پیڑ تھے سب کاٹ ڈالے۔ گلاب کی جھاڑیاں انگور کی بیلیں۔ پھولوں کی قطاریں۔ سب اکھاڑ دیں۔ حالت یہ ہو گئی کہ شام کو جب قبلہ والد صاحب دفتر سے لوٹے تو گھر بھی نہ پہچان سکے۔ میں نے انہیں حیران اور پریشان دیکھ کر بہت اطمینان سے کہا۔ آیئے۔ آیئے! پریشان کیوں ہوتے ہیں؟ آپ ہی کا گھر ہے۔ اس پر والد صاحب مجھ سے کچھ نہ بولے، ٹرٹر باغیچہ کی طرف دیکھتے رہے۔ میں نے کہا۔ آپ اس طرح گھور گھور کر کیا دیکھ رہے ہیں؟ پتا جی، سچ بات تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ میں نے کیا ہے۔ وہ جارج واشنگٹن والی گھٹنا..... لیکن اس کے بعد والد صاحب نے مجھے بولنے نہیں دیا اور ایک کٹے ہوئے درخت کا تنا اٹھا کر میری جو مرمت کی تو..... خیر میں جارج واشنگٹن نہ بنا۔ اسکول ماسٹر تو بن ہی گیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس دن سے میری داہنی ٹانگ لنگڑی ہو گئی۔ اور بائیں بازو کی ایک ہڈی ٹوٹ گئی۔

تو بچو! کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چاہے ٹانگ لنگڑی ہو جائے، چاہے بازو ٹوٹ جائے، چاہے جان چلی جائے لیکن ایمانداری اور سچائی کو ہمیشہ پیار کرو۔ ہمیشہ سچ بولو۔ بلکہ پہلے بات کو تولو پھر سچ بولو اور کہو۔

امی سے ایمانداری۔

## آ۔ آخرت

بچو تم آخرت یعنی موت سے ڈرتے ہو کیا۔؟ لیکن آخرت سے کسی کو نہ تو ڈرنا چاہئے صرف زندگی سے ڈرنا چاہئے۔ زندگی بڑی خطرناک اور خونخوار۔ موت آرام و آسائش دینے والی ہے۔ بچو ابھی تم زندگی کی پہلی منزل پر ہو اور تمہیں اسکول سے، اسکول ماسٹر سے، قاعدہ سے، مانیٹر سے، یعنی ہر چیز سے ڈر لگتا ہے۔ لیکن ابھی تو یہ زندگی کی پہلی منزل ہے۔ جیسے جیسے زندگی بڑھتی جائے گی۔ تمہارے ڈر میں تمہاری مصیبتوں میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اب تم کھل کر ہنستے رہو پھر ڈر کر ہنسو گے۔ تمہیں خدا کا بھی خوف نہیں ہے۔ پھر تم ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز سے بھی ڈرو گے۔ مندر اور مسجد سے ڈرو گے اور یہ ڈر بڑھتا ہی چلا جائے گا یہاں تک کہ تم بچپن سے لڑکپن، لڑکپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے تک ترقی کرتے ہوئے موت کی گود میں سو جاؤ گے۔ لیکن جب تک زندہ رہو گے ڈرتے رہو گے۔ کیونکہ ہمارے بزرگوں نے ہمارے سماج کی نیم، زندگی کی نیم، اس دنیا کی نیم جس میں رہتے ہیں ڈر پر تعمیر کی ہے۔ محبت پر نہیں۔ محنت پر نہیں۔ صرف ڈر پر۔ یہاں موت نہیں بلکہ زندگی خطرناک ہے۔

بچو جرمن کے مشہور شاعر ریلکے نے ایک بار خدا سے دعا کی میں تجھ سے اپنی مرضی کے مطابق زندگی نہیں مانگتا۔ میں تجھ سے صرف موت مانگتا ہوں۔ اپنی مرضی کے مطابق موت۔

آؤ بچو ہم بھی یہی دعا کریں کیونکہ مرجانے کے بعد یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ زندگی کیسے گزری بلکہ یہ کہ اس کی موت کیسے واقع ہوئی۔ اس لئے کہو آسے آخرت

## ک ۔ کتّا ۔

بچو! کتا بڑا وفادار جانور ہے۔ یہ گھر میں دن بھر زنجیر سے بندھا رہتا ہے اور مہمانوں کو دیکھ دیکھ کر غراتا ہے۔ جب گھر میں مہمان نہ ہوں تو زنجیر سے بندھے بندھے سو جاتا ہے اس کے بعد خواب میں مہمانوں کو دیکھ کر غراتا ہے۔ بھونکتا ہے کیونکہ کتا بڑا وفادار جانور ہے اور انسان کا بہت اچھا دوست ہے۔ گھر کا کتا دن کو سوتا ہے اور رات کو جاگتا ہے اور باغیچہ کی چہار دیواری کے چاروں طرف چکر لگاتا ہے۔ وہ بجلی کے کھمبوں، پولیس والوں اور چوکیداروں کو دیکھ کر بھونکتا ہے۔ کیونکہ بغیر اجازت اندر آنا منع ہے۔ کتے کو اپنی آواز بہت پیاری معلوم ہوتی ہے وہ خود بھی سنتا ہے اور دوسروں کو بھی سناتا ہے۔ اس لئے گھر والے بھی تمام رات اپنے کتے کی آواز سے مسحور ہو کر میٹھی نیند سوتے ہیں۔ کتا انسان کا دوست اور وفادار جانور ہے۔

گھر کا کتا تو دن کو سوتا ہے لیکن گلی کا کتا نہ دن کو سوتا ہے اور نہ رات کو اور چلّا چلّا کر محلے والوں کو ہر آنے والے خطرے سے آگاہ کرتا رہتا ہے۔ اس کی آنکھیں اس قدر مشکوک ہوتی ہیں کہ گلی میں سے ہر گزرنے والے کو مجرم سمجھتا ہے۔ یہ بھی کتے کی وفاداری ہے۔ جب کتا پیار سے کاٹے تو فکر نہ کرنی چاہیئے۔ اسپتال میں جا کر چپکے سے چودہ انجکشن لگوا لینا چاہیئے۔ کیونکہ کتے کی خوشی اسی میں ہے۔ تمہیں اس شکاری کتے کی کہانی یاد ہو گی جس نے بھیڑیئے سے اپنے مالک کے بیٹے کی جان بچائی تھی۔ اس طرح کے کتے صرف کہانیوں میں پائے جاتے ہیں۔ عام گھروں میں جو کتے ہوتے ہیں وہ بچوں کو بھیڑیوں سے نہیں بچانے موقع ملے تو انہیں خود کھا جاتے ہیں۔ اور یہ بچوں تک محدود نہیں رہتے بڑے بوڑھوں پر بھی دانت رکھتے ہیں۔

مشہور کہاوت ہے کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ کتے کی محبت کا بھی یہی حال ہے وہ دن رات بازار گلی کوچوں میں بدنام ہوتا پھرتا ہے۔ کتوں کو دیکھ کر آج کل نوجوانوں نے بھی اس پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔ کتے کے بارے میں کئی کہاوتیں مشہور ہیں۔ جیسے کتا کتے کا دشمن ہوتا ہے۔ کتا بلی کا دشمن ہے۔ کتے کو گھی ہضم نہیں ہوتا۔ دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔ ان تمام کہانیوں سے کتے کی ذات پر بڑا اچھا اثر پڑتا ہے۔

کتا کسی زمانے میں بھیڑیا تھا اب صرف کتا ہے اور انسان کا وفادار دوست ہے۔ اب اس نے جنگل چھوڑ دیا ہے اور انسان کی خدمت کو اپنا اصول بنایا ہے۔ اس کے صلے میں انسان نے اس کے گلے میں زنجیر ڈال دی ہے اور اپنے برادری کے کتوں سے نفرت کرنا سکھا دیا ہے۔ یہی غلامی کا پہلا سبق ہے۔

کتے کتے ہوتے ہیں اور کتے انسان بھی ہوتے ہیں اور کتے ہر وقت اپنے مالک کی دی ہوئی زنجیر سے بندھے ہوئے اُف اُف کرتے ہیں اور اپنے مالک کا اشارہ پاکر دم ہلانے لگتے ہیں۔ ان کتوں کو گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے دیئے جاتے ہیں۔ دودھ بھرے پیالے ان کے سامنے رکھے جاتے ہیں۔ چاہے دنیا کے دوسرے کتے بھوکے ہی کیوں نہ رہ جائیں۔ یہ اس لئے ہوتا ہے کہ ان کتوں کے گلے میں مالک کے پٹے پڑے ہوتے ہیں اور ایک لمبی سنہری زنجیر ہوتی ہے۔

بچو! جب تم بڑے ہو تو کتے کی وفاداری کو کبھی نہ بھولنا۔ پھر ایک دن تمہیں بھی لمبی سی زنجیر مل جائے گی اور گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے اور دودھ کے پیالے بیوقوف۔ آؤ بچو ہم کتے کی وفاداری کے گیت گائیں اور کہیں ک سے کتا۔

خ ۔ خربوزہ ۔

بچو! تم نے اکثر خربوزہ کھایا ہوگا۔ خربوزہ ہندوستان کا مشہور پھل ہے ہندوستان کا ایک اور مشہور پھل ہے۔ جسے "پھوٹ" یعنی ہندو مسلم لڑائی کہتے ہیں۔ ہندوستان کے پھل اور میوے بہت مشہور ہیں اور وہ دور دور تک غیر ممالک میں جاتے ہیں۔ لیکن پھوٹ کا میوہ باہر نہیں جاتا۔ انگریز اسے بالکل نہیں کھاتے۔ انگریز خربوزہ بھی نہیں کھاتے۔ کیونکہ اس سے ہیضہ پھیلنے کا ڈر ہوتا ہے۔ ہندوستان کی ہر چیز سے ہیضہ پھیل سکتا ہے۔ خربوزہ سے، ترکاری سے، دودھ سے، پانی سے، ہوا سے، مٹی سے اس دیس کے ذرے ذرے میں ہیضہ چھپا ہوا ہے۔ اس لئے خربوزہ کبھی نہیں کھانا چاہیئے۔ خربوزہ باہر سے بڑا خوبصورت اور خوشبودار ہوتا ہے۔ لیکن اندر سے بالکل پھیکا اور بیجوں سے بھرا ہوا۔ کچھ آدمی بھی خربوزے کی طرح ہوتے ہیں۔ لیکن ..... ہم انہیں خربوزہ نہیں کہتے..... ہیں۔ بزرگ کہتے ہیں کہ دنیا کے ہر ملک میں بڑے آدمی ہوتے ہیں۔ لیکن جتنے خربوزہ ہندوستان میں ہوتے ہیں اور کہیں نہیں ہے۔ خربوزہ میں ایک اور خاصیت بھی ہے وہ یہ کہ جب چھری خربوزہ پر گرتی ہے یا خربوزہ چھری پر گرتا ہے تو کٹتا خربوزہ ہی ہے۔ لیکن یہ خاصیت بڑے آدمیوں میں نہیں پائی جاتی وہ کبھی نہیں کٹتے۔ ہمیشہ دوسروں کو کٹواتے ہیں۔ اس لئے کہو خ سے خربوزہ ۔

---

گ ۔ گالی ۔

بچو! تمہیں گالی دینا پسند ہے نا۔ اب ت ث سیکھنے سے بہت پہلے

تم گالی دینا سیکھ جاتے ہو۔ میں نے تمہیں کھیل کے میدان میں گالی دیتے اکثر سنا ہے۔ تم گالی بک کر بہت خوش ہوتے ہو۔ خاص کر ماں بہن کی گالی۔

لیکن بچو! اگر تم ذرا بھی سوچو تو ماں بہن کی گالی کوئی گالی نہیں ہے اس گالی سے تمہاری وہ دلچسپی معلوم ہوئی ہے جو تمہیں اپنے سے مخالف "سیکس" میں ہے۔ اب ت ث سیکھنے سے پہلے ہی تم یہ بات جان لیتے ہو کہ لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے سے الگ ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لڑکے لڑکیاں کو اور لڑکیاں لڑکوں کو پسند کرتی ہیں۔ اور جب یہ لڑکے اور لڑکیاں جوان ہوتی ہیں تو ایک دوسرے سے شادی بیاہ کرتے ہیں اور وہی کام کرتے ہیں جس کی تم گالی دیتے ہو۔ بھلا اس گالی میں کیا بری بات ہے۔ اگر یہ گالی ہے تو خود تم ایک گالی ہو۔ تمہاری پیدائش گالی ہے۔ تمہاری زندگی گالی ہے کیونکہ اس گالی کی وجہ سے تم اپنی ماں کے پیٹ سے جنے گئے ہو۔ تم آسمان سے نہیں گرے نہ تم پریوں کے دیش سے آئے ہو۔ نہ تم سارس کی چونچ سے نکلے ہو۔ یہ کہانیاں تمہاری اوقات چھپانے کے لئے کی جاتی ہیں۔ اس میں تم اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہو۔ جس طرح خوبصورت بلّی اور بلّے کے بچے اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں۔ تم دکھ، درد، مصیبت کی اولاد ہو۔ اس لئے تم اس قدر معصوم اور بھولے ہو۔ میں نے آج تک کسی خوبصورت بلی کے بچے کو ماں بہن کی گالی دیتے ہوئے نہیں سنا۔ پھر تم انسان کے بچے ہو کر کیوں گالی دے کر ایک فخر محسوس کرتے ہو۔

بچو! ماں بہن کی گالی کوئی گالی نہیں ہے۔ جب تمہیں کوئی ایسی گالی

دے تو تم چپ ہو جاؤ۔ مسکرا کر گالی دینے والے کو سمجھا دو کہ یہ گالی نہیں ہے یہ تو اپنا منہ چڑانا ہے اپنے آپ کو تھوکنا ہے۔

گالی وہ ہوتی ہے جب ایک انسان دوسرے انسان کو بھوکا رکھتا ہے۔ گالی وہ ہوتی ہے جب تمہیں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا جائے۔ گالی وہ ہوتی ہے جو تم سے پیار، محبت سے اور مسکراہٹ سے غلط کام نکلوالے۔ ایسی حالت ایک سخت گالی ہوتی ہے۔ اسے گالی دو جو تمہیں اپنے برابر کا نہ سمجھے جو تمہیں غلام بنانا چاہے جو تمہارے گلے میں زنجیر اور پٹہ ڈالنا چاہے جو وفاداری پر پیٹھ ٹھوکنا چاہے۔ تمہیں یتیم خانے میں رکھ کر چندہ وصول کرے۔ تمہیں بازار میں بیچنا چاہے۔ تمہاری آزادی کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہے۔

اس وقت گالی دو اور ضرور گالی دو۔ میں گالی کو برا نہیں سمجھتا۔ لیکن سچی گالی دو۔ جھوٹی گالی دینے سے ہمیشہ بچو اور کھوگ سے گالی۔

---

گھ ۔ گھر

گھر چھوٹا ہو یا بڑا۔ اپنا گھر بڑا خوبصورت ہوتا ہے۔ کیونکہ گھر میں ماں باپ ہوتے ہیں۔ بھائی بہن ہوتے ہیں ان سب کا پیار ہوتا ہے۔ جو گھر سے باہر کسی قیمت پر نہیں مل سکتا۔ اس لئے سب بچے گھر کو بہت پسند کرتے ہیں۔

لیکن کچھ بچوں کے پاس گھر نہیں ہوتے کیونکہ ان کے ماں باپ کے پاس بھی گھر نہیں ہوتا۔ یہ بچے درختوں کے نیچے سوتے ہیں۔ فٹ پاتھوں پر لیٹتے ہیں، یا کسی ٹوٹی پلیا کے نیچے پڑ رہتے ہیں۔ دوسری طرف ایسے بھی بچے ہوتے ہیں۔ جو

ہوتے تو اکیلے ہیں لیکن ان کے لئے گھر میں دس کمرے ہوتے ہیں جن میں پچاس بچے آسانی سے رہ سکتے ہیں۔

پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی بچے کے پاس ایک گھر بھی نہیں ہوتا اور کسی بچے کے پاس بہت سے گھر ہوتے ہیں۔ جس میں اس بچے کے ماں باپ کبھی کبھی رہتے ہیں۔ ایک گھر سردیوں میں رہنے کے لئے ایک گھر گرمیوں میں رہنے کے لئے۔ ایک گھر موسم بہار کے لئے۔ ایک گھر موسم خزاں کے لئے۔ ایک گھر شادی بیاہ کے لئے۔ ایک گھر میں سامان بند رہتا ہے۔ ایک گھر میں الو بولتے ہیں۔ اگرچہ یہاں بچوں کو چھکنا چاہئے اور جو بچے ٹوٹی پلیا کے نیچے یا فٹ پاتھ پر رہتے ہیں ان کو یہ فالتو گھر مل جانا چاہئے کیونکہ دنیا کے ہر بچے کو پیار کی ضرورت ہے۔

کبھی کبھی اچھے بسے بسائے گھر برباد ہو جاتے ہیں۔ بچہ دیکھتا ہے کہ اس کا باپ صبح سے شام تک گھر پر نہیں رہتا۔ کیونکہ اس کے پاس کام نہیں ہے۔ پھر ایک دن بچہ دیکھتا ہے کہ اس کے باپ کے پاس اسکول کی فیس نہیں ہے اور اب بچہ اسکول نہیں جا سکتا۔ پھر ایک گھر میں کھانا نہیں پکتا۔ پھر ایک دن کچھ سپاہی آتے ہیں اور بچے کو اس کے ماں باپ کے ساتھ ان کا اسباب باہر پھینک کر نکال دیتے ہیں اور بچے کا گھر چھن جاتا ہے۔

ہمارے نئے اصول کے مطابق کوئی بسے ہوئے گھر کو بچے سے نہیں چھین سکے گا۔ کوئی اس کی کتابیں باہر نہیں پھینک سکے گا۔ اس کے کھلونے اس کے گھر میں رہیں گے وہ گلی کی نالی میں بہائے نہیں جائیں گے۔

لیکن ہمیشہ سپاہیوں کے آنے سے گھر برباد نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی ایک نہیں

لاکھوں گھر دیکھتے دیکھتے ہی برباد ہو جاتے ہیں۔ بچوں تم نے بہت گھروں کو جلتے دیکھا ہوگا۔ کبھی کبھی گھر کو اپنے ہی چراغ سے آگ لگ جاتی ہے۔ جیسا آج کل ہمارے ملک میں ہو رہا ہے۔ کبھی کبھی یہ آگ آسمان سے برستی ہے۔ جیسے پچھلی لڑائی میں ناگاساکی اور ہیروشیما میں ہوا تھا۔ آسمان سے ایک ایٹم بم گرا اور گرتے ہی لاکھوں گھروں کو برباد کر دیا۔

اس لئے بچوں اپنے گھروں کی حفاظت کرو۔ اور اس آگ سے ہمیشہ بچو۔ جو ایک منٹ میں لاکھوں گھر ایٹم بم کے دھماکے سے گر جاتے ہیں۔ اس لئے کہو گھ سے گھر۔

---

چ ـــ چور

بچو! چور وہ ہوتا ہے جو تمہاری چیز چرا کر لے جائے جس طرح چوہے طاق پر سے تمہاری مٹھائی لے جاتے ہیں۔ لیکن چور صرف چوہے ہی نہیں ہوتے بلکہ انسان بھی چور ہوتے ہیں۔ چوہے اور انسان اس لئے چوری کرتے ہیں کہ ان کے پاس وہ چیز نہیں ہوتی جس کی وہ چوری کرتے ہیں جو دوسروں کے پاس ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر چوہوں کے پاس مٹھائی ہوتی تو وہ کیوں تمہاری مٹھائی چراتے۔ ہرگز نہیں۔ یہی حال انسانوں کا ہے۔ وہ بھی ایک طرح کے چور ہیں اور وہی چیز چراتے ہیں جو ان کے پاس نہیں ہوتی۔ چور چوری جب کرتے ہیں جب وہ بھوکے ہوتے ہیں۔ ننگے ہوتے ہیں، یا غریب ہوتے ہیں۔ چوروں سے ہمیشہ بچنا چاہئے۔ چوہوں سے بھی بچنا چاہئے۔ کیونکہ ان سے پلیگ پھیلتا ہے۔ چوہوں کو بلی کھاتی ہے اور چوروں کو

حکومت۔ لیکن کبھی کبھی حکومت چوروں کی مدد کرتی ہے یا خود چور بن جاتی ہے اور لوگوں کی چیزیں چرا لیتی ہے۔ جب تم دیکھتے ہو کہ رام پھٹے کپڑے پہنے اسکول آتا ہے اور موہن ریشم کی پوشاک پہن کر۔ جب دیکھو کہ گوردیال شہد اور مکھن سے ناشتہ کرتا ہے اور چنوں کے پاس سوکھی روٹی کھانے کو نہیں۔ جب دیکھو کہ ہرش کی آنکھیں کنول کی طرح کھلی ہیں۔ بالوں میں خوشبودار تیل لگایا ہوا ہے۔ اور منش کی آنکھیں لال لال ہیں۔ ہونٹوں پر افسوس اور ناامیدی کی پپڑیاں جمی ہیں اور آنسوؤں کی بوندیں اس کی بڑی بڑی، سہمی سہمی، حیران حیران، پتلیوں پر جھک رہی ہیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ حکومت خود چور ہے یا چوروں سے ملی ہوئی ہے۔ ایسی حالت میں ملک کی ساری دولت سب میں برابر بانٹ دینی چاہیئے۔ تاکہ کوئی کچھ چرا ہی نہ سکے۔ نہ حکومت رہے اور نہ چور۔ کیونکہ جہاں چور ہے رہتے ہوں گے وہاں ملی بھی رہتی ہوگی اور جہاں چور ہیں وہاں حکومت بھی ہوگی۔ اس لئے کہو سچ سے چور۔

---

چھ ۔ چھڑی

گروجی کی چھڑی سے سب بچے ڈرتے ہیں۔ اس کا مزہ سب نے دیکھا ہے میں نے بھی چکھا ہے۔ جب میں سبق بھول جاتا ہوں تو گروجی کی چھڑی چلتی ہے اور کبھی کبھی فرنٹیر میل سے بھی تیز چلتی ہے۔ اس لئے چھڑی نے ہمیں بہت سے سبق سکھائے اور یاد کرائے۔ مثال کے طور پر اس چھڑی نے ہمیں یاد کروایا کہ انگریزی حکومت کا سورج کبھی غروب نہیں ہوتا۔ لیکن آج وہ سورج

ڈوب چکا ہے۔

اس چھڑی نے ہمیں یہ سکھایا کہ اگر ایک بنیا ایک کسان کو فصل کے وقت دس روپیہ ادھار دیتا ہے تو دس سال میں اس کی کتنی زمین قرق ہو سکتی ہے۔ آج اس چھڑی کی بدولت کسان بیاج دینے سے اور زمین قرق کرانے سے انکار کر رہا ہے اور بنیئے کا سارا حساب بگڑتا جا رہا ہے۔ پرانا حساب جا رہا ہے نیا حساب آ رہا ہے۔ جس پر بنیئے کے بیاج پر بیاج کی کوئی انتہا نہیں۔

چھڑی کے حساب سے اگر ایک آدمی کماری انتریب سے مدراس جائے تو تین سال میں پہنچے گا۔ (اگر راستے میں انتقال نہ کر گیا ہو تو) نئے حساب سے وہ تین دن میں پہنچتا ہے اور جب تک یہ نیا اصول آپ تک پہنچے گا یہ وقت اور بھی گھٹ جائے گا۔

چھڑی کے جغرافیہ کے حساب سے سائبیریا میں گیہوں پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن آج کا نیا اصول سائبیریا کے برفیلے میدان میں گیہوں تو کیا گوبھی، مٹر آلو سب کچھ پیدا کر رہا ہے۔

چھڑی کے تاریخ کے حساب سے وہ حکومت سب سے بڑی سمجھی جاتی تھی جس کے پاس سب سے لمبی توپ ہوتی تھی۔ نئے اصول کے حساب سے وہ حکومت سب سے زیادہ بڑی سمجھی جاتی ہے جس کے پاس سب سے زائد فاختائیں ہوں۔

بچو! تم نے وہ کہانی بھی سنی ہوگی جس میں ایک شکاری نے جال پھینک کر سب سے زائد کبوتر پکڑے تھے۔ پھر وہ سارے کبوتر متحد ہوئے اور اپنے پروں کا زور لگا کر جال سمیت اڑ گئے تھے اور شکاری کی پہونچ سے

باہر چلے گئے۔

بچوں ہمارا نیا اصول شکاریوں کے لئے نہیں ہے۔ بھولے بھالے کبوتروں کے اتفاق کے لئے ہے۔ آج شکاری بے چارہ منہ تاک رہا ہے اور کبوتر آسمان پر جال سمیت اڑے جا رہے ہیں۔

نئے اصول کے گرو جی بھی نئے ہیں وہ بچوں کو چھڑی سے نہیں مارتے انہیں پھول چڑھاتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ چھڑی کا سبق بھلایا جا سکتا ہے لیکن پھولوں کا سبق کوئی نہیں بھول سکتا۔ اس لئے آنے والی زندگی کا انتظار کرو اور کہو چھ سے چھڑی۔

---

ز سے زمین

بچو! اس وقت تم زمین پر بیٹھے ہو۔ اگر تم اس وقت ہوائی جہاز میں ہوتے تو میں کہتا کہ تم ہوا میں اڑ رہے ہو۔ خیر! بچو یاد رکھو۔ زمین بڑے کام کی چیز ہے۔ زمین سے اناج پیدا ہوتا ہے۔ تاکہ کاشت کار لگان ادا کر سکیں۔ زمین سے سونا نکلتا ہے تاکہ مالدار حکومت کر سکیں۔ زمین سے لوہا نکلتا ہے تاکہ جنگ کے لئے توپیں اور بندوقیں بن سکیں۔ زمین سے مٹی نکلتی ہے تاکہ ہماری تمہاری قبریں بن سکیں اور سب سے بڑھ کر زمین کا فائدہ یہ ہے کہ وہ گول ہے۔ اوپر، نیچے، دائیں بائیں ہر طرف سے گول ہے۔ جدھر سے بھی دیکھو اور اگر نہ بھی دیکھو تو بھی گول ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جھگڑے کی جڑ زمین ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ زر، زن زمین ان تینوں میں "ز" ہے اور ان تینوں ہی کی وجہ سے دنیا میں لڑائی ہوتی

ہے اور جھگڑے پھیلتے ہیں۔ میں ان لوگوں سے متفق نہیں ہوں کہ ان تینوں چیزوں سے کوئی بھی بری نہیں ہے۔ بری چیز تو وہ ہے جو ایک عرصے سے انسان کے دماغ میں بس گئی ہے۔ "نفع" اگر یہ دور ہو جائے تو دنیا میں ہر طرف ہریالی دکھائی دے اور یہ خوبصورت زمین خوشی سے ناچتے ناچتے اور گول ہو جائے۔ بلکہ گول مٹول ہو جائے اس لئے کہو نہ سے زمین۔

---

جھ — جھگڑا

بچو! جھگڑا وہ ہے جو ابھی کچھ سال ہوئے ختم ہوا ہے اور اب پھر اس کی تیاری ہو رہی ہے۔ جب لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا تو اسے امن کا زمانہ کہتے ہیں۔ امن کے خواب دیکھتے ہیں۔ پہلے جھگڑا اکّے دکّے آدمیوں میں ہوا کرتا تھا۔ پھر قبیلوں کے درمیان ہونے لگا۔ پھر بادشاہوں میں ہونے لگا۔ اور اب ملکوں اور ذاتوں پر جھگڑا ہوتا ہے۔ لیکن جواب وہی ہوتا ہے۔ یعنی لوگ مرتے ہیں۔ عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہوتے ہیں۔ خون کی ندیاں بہتی ہیں اور آخر میں انصاف جیت جاتا ہے۔ جب سے دنیا میں لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں۔ ایمانداری اور سچائی کی جیت ہوئی۔ اس سے قبل کی لڑائی میں بھی ایمانداری اور سچائی جیتی ہے۔ آخر میں ایک دن وہ آئے گا جب دنیا میں آدمی نہ رہے گا۔ صرف ایمانداری اور سچائی رہ جائے گی اور یہ ہی لڑائی جھگڑے کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

اس لئے کہو جھ سے جھگڑا۔

---

ٹ ــ ٹامی

بچو! ٹامی عام طور سے انگریز سپاہیوں کو کہتے ہیں۔ یہ سپاہی انگلستان سے آیا اور ایک صدی ہندوستان رہ کر پھر ولایت لوٹ گیا۔ سپاہی تو ہندوستانی بھی ہوتے ہیں لیکن وہ ٹامی نہیں ہوتے۔ ٹامی اور ہندوستانی سپاہی میں یہ فرق تھا کہ ٹامی سفید ہوتا تھا اور ہندوستانی کالا۔ ٹامی کو تقریباً ۷۵ روپے تنخواہ ملتی تھی اور ہندوستانی کو تیس روپے، ٹامی کی ضروریات زندگی ہمیشہ زائد رہیں اور ہندوستانی سپاہی کی کم۔ ہندوستانی سپاہی نے بھی اپنی ضروریات زندگی بڑھانے کی کوشش کی۔ لیکن اس سے اس کی تنخواہ نہیں بڑھی۔ تب اس نے ڈانٹ ڈپٹ کر کہا تو یہ ملک چھوڑ جس سے میری تنخواہ بھی بڑھ جائے۔ میں نے بہت صبر کیا ہے۔ تم بھی ہندوستانی سپاہی کی طرح صبر کرنا سیکھو اور کہوٹ سے ٹامی۔

---

ٹھ ــ ٹھٹھہ

بچو! ٹھٹھا سے کہتے ہیں جو دوسروں کو ہنسائے آدمی دوسروں کی تکلیف پر ہنستا ہے۔ اس لئے سب سے اچھا ٹھٹھہ وہ ہے جو دوسروں کو تکلیف دے۔ بچو یاد رکھو۔ تم جانوروں میں انسان ہی ایسا جانور ہے جو دوسروں پر ہنستا ہے اور کسی جانور کو ہنسنا نہیں آتا۔ کیونکہ وہ دوسروں کو تکلیف میں دیکھ کر خوش نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے انسان کو افضل کہا جاتا ہے۔

بچو تم نے دیکھا ہوگا کہ جب کوئی کیلے کے چھلکے پر سے پھسلتا ہے تو کتنی ہنسی آتی ہے۔ جب کوئی بازار میں ٹکرا کر گر پڑتا ہے تو ہم ہنستے ہیں۔ اس دن اسکول

کے باہر آلو چھولے بیچنے والے کی ٹوکری گندی نالی میں پھینک دی تھی تو تم سب بچے کس طرح ٹھٹھے مار مار کر ہنس رہے تھے۔ ان سب باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ تم سب انسان کے بچے ہو جانور کے نہیں۔

ہنسنا انسان کے لئے بہت ضروری ہے اس لئے رومن لوگ آدمیوں کو شیروں سے پھڑوا کر بہت خوش ہوتے تھے اور ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ آج کل لوگ آدمیوں کو شیروں سے پھڑوا کر نہیں ہنستے بلکہ توپ سے اڑا کر خوش ہوتے ہیں۔ ان کے پاؤں میں غلامی کی زنجیر ڈال کر ٹھٹھے لگاتے ہیں۔ بچو اگر تم بھی بڑے آدمی بننا چاہتے ہو تو دوسروں کو تکلیف میں ڈال کر خوب ہنسو۔ ٹھٹھے لگاؤ۔ دوسروں کو ہنساؤ اور کہو ٹھ سے ٹھٹھا۔

---

## ڈ ۔ ڈاکو

بچو! ڈاکو چور کا بڑا بھائی ہوتا ہے اور بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ تمہارا بڑا بھائی تم سے کس طرح کھلونے چھین کر چلا جاتا ہے اور تم روتے رہ جاتے ہو۔ اس وقت تم سوائے رونے کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ تمہارا بڑا بھائی تم سے زیادہ طاقت ور ہے۔ وہ بڑا ہے اور تم چھوٹے ہو۔ یہی حال ڈاکو کا ہے۔ وہ بھی اپنے سے چھوٹے اور کمزور آدمی پر ہاتھ ڈالتا ہے۔ اور اس سے سب کچھ چھین لیتا ہے۔

جب ایک انسان ایسا کرتا ہے تو ہم اسے ڈاکو کہتے ہیں اور جب دو مل کر ایسا کرتے ہیں تو ہم اسے قبیلہ کہتے ہیں۔ جب تین انسان ایسا کرتے ہیں تو ہم اسے

جاگیردار کہتے ہیں اور جب چار مل کر کرتے ہیں تو اسے سامراج کہتے ہیں اور پھر مزے کی بات یہ ہے کہ جب انسان ڈاکہ ڈالتا ہے تو ہم اسے پھانسی کی سزا دیتے ہیں۔ لیکن جب چار آدمی مل کر یہ کام کرتے ہیں تو انہیں خطاب سے نوازا جاتا ہے۔ قوم انہیں اپنا ہیرو سمجھتی ہے اور پوجتی ہے۔ سینکڑوں برسوں تک ان کا نام روشن رہتا ہے۔ ان کے بیٹوں کو جاگیریں دی جاتی ہیں اور وہ لوگ بادشاہ بنا دیئے جاتے ہیں اور ان کو خدا کے بعد سمجھا جاتا ہے۔ رام۔ رام۔ زمانے کو کیسی ہوا لگ گئی ہے۔ بچو! ان ڈاکوؤں سے ہمیشہ بچو اور دنیا کی طاقت کو آپس میں بانٹ لو۔ تاکہ کوئی زبردست نہ رہے۔ کوئی کمزور نہ رہے۔ جب تک ایسا نہ ہو پرائمر پڑھتے جاؤ اور کہو ڈسے ڈاکو۔

---

ڈھ سے ڈھیر

بچو بہت سی چیزیں ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں تو اسے ڈھیر کہتے ہیں۔ جنگل میں ایک طرح کا ڈھیر ہوتا ہے درختوں کا۔ اسکول بھی ایک طرح سے ڈھیر ہوتا ہے بچوں کا۔ پرانے زمانے میں حکومت کی طرف سے اناج کا ڈھیر رکھا جاتا تھا۔ تاکہ قحط کے دنوں میں لوگوں کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہو۔ مغل بادشاہوں کے زمانے میں بھی اناج کے بڑے بڑے ڈھیر رکھے جاتے تھے۔ جس میں ہر سال نیا اناج بھرا جاتا تھا۔ آج کل حکومت گودام بناتی ہے۔ لیکن اس میں اناج نہیں بھرا جاتا۔ ان میں روپے اور نوٹوں کے ڈھیر رکھے جاتے ہیں۔ ان ڈھیروں کو لوگ بینک کے نام سے پکارتے ہیں۔ قحط کے دنوں میں اناج کے بدلے روپے اور نوٹ بانٹے جاتے ہیں۔

روپیہ چاندی کا ہوتا ہے اور نوٹ کاغذ کا۔ اور یہ دونوں چیزیں کھانے میں اچھی نہیں۔ ابھی کچھ سال ہوئے بنگال میں قحط پڑا تھا اور لاکھوں لاشوں کے ڈھیر لگ گئے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ساہوکاروں نے اناج کا ذخیرہ چھپا لیا تھا۔ اگر اس وقت حکومت کے پاس اناج کے ڈھیر ہوتے تو حکومت فوراً اناج نکال کر عوام میں تقسیم کرتی۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ شاید اب لوگوں کو عقل آجائے اور شاید گاؤں گاؤں اناج کے ڈھیر قائم ہو جائیں۔

انگلستان ایک جزیرہ ہے۔ لیکن ہندوستان ایک ڈھیر ہے۔ بلبلوں کا

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

ہندوستان میں پچاس کروڑ بلبلیں رہتی ہیں۔ ایسی روتی، بسورتی، فاقہ کرتی بلبلیں دنیا کے کسی اور حصّے میں موجود نہیں۔ صرف ہندوستان ہی ان بلبلوں کا ڈھیر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ غلامی، بے ایمانی، ناانصافی، ناامیدی اس لئے کہو ڈھ سے ڈھیر۔

---

ط سے طوطا

بچو طوطا اس آدمی کو کہتے ہیں جو اپنے آدمی کا سدھایا ہوا ہوتا ہے اور وہی کہتا ہے جو اس کا مالک اس سے کہلوانا چاہتا ہے۔ تم نے اکثر ایسے طوطے دیکھے ہوں گے۔ یہ ہر جگہ ہر ملک اور ہر ذات میں پائے جاتے ہیں۔ اور دفتر جلسوں، اسمبلیوں، گھروں میں اپنے مالک کے رٹائے ہوئے جملے استعمال کرتے

ہیں۔ سچ پوچھو تو دنیا میں انہیں طوطوں کی حکومت ہے۔

مالک ہمیشہ ان طوطوں کو اپنے پنجرے میں بند رکھتا ہے اور انہیں بڑے پیار سے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتا ہے۔ کیونکہ طوطا بڑا وفادار ہوتا ہے اور وہ اپنے مالک کے رٹائے جملوں کے علاوہ اور کچھ نہیں بولتا۔

طوطا ایک قسم کی چڑیا بھی ہے اس کا رنگ ہرا، چونچ مڑی ہوئی اور زبان چمچے کی طرح ہوتی ہے۔ وہ بھی پنجرے میں رہنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے مالک کے یاد کرائے ہوئے جملے دھرانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے لوگ اسے بھی طوطا کہتے ہیں۔ پھر بھی جانور طوطا انسان طوطے سے کم آنکھیں بدلنے والا ہوتا ہے۔ اس لئے طوطا جانور کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی بس کہوط سے طوطا۔

---

## تھ سے تھیلی

جیسے بلیاں کالی ہوتی ہیں۔ اور سفید بھی ہوتی ہیں اسی طرح تھیلیاں بھی کالی اور سفید ہوتی ہیں۔ لیکن آج کل سفید تھیلی کم دکھائی دیتی ہے۔ اور کالی تھیلیاں بہت پائی جاتی ہیں۔ کالی اور سفید تھیلی کی پہچان یہ ہے کہ کالی تھیلی بھاری ہوتی ہے اور سفید تھیلی ہلکی۔ کبھی کبھی ان میں چھید ہوتا ہے۔ جس سے جتنے روپے ڈالو سب غائب ہو جاتے ہیں۔ لیکن کالی تھیلی میں چھید نہیں ہوتا بلکہ اس میں چھید کے بجائے خانے ہوتے ہیں۔ جن میں روپے ڈالو اور اندر ہی اندر جمع ہو جاتے ہیں۔ اور اس کا وزن بڑھتا چلا جاتا ہے۔

کالی تھیلی کا بھاؤ لڑائی کے بعد سے بہت بڑھ گیا ہے اور یہ تھیلی اب

بہت اونچے اونچے مقامات پر دکھائی دینے لگی ہے۔ جہاں پر پہلے صرف تھیلی دکھائی دیتی تھی۔

کچھ لوگ سفید تھیلی میں کالی تھیلی چھپا کر رکھتے تھے۔ یعنی مذہب کی آڑ میں دولت لوٹتے تھے۔

ایسے لوگوں کو ہماری زبان میں "تھیلی باز" کہتے تھے۔ جو جتنا بڑا تھیلی باز ہوگا اس کی تھیلی باہر سے اتنی ہی سفید اور اندر سے اتنی ہی کالی ہوگی۔

سفید تھیلی دن کو نکالتے ہیں۔ جبکہ کالی تھیلی رات کے اندھیرے میں دکھائی دیتی ہے۔ سفید تھیلی محنت کرنے والے ہاتھوں میں دکھائی دیتی ہے۔ کالی تھیلی گندی الماریوں میں بند ہوتی ہے۔ سفید تھیلی میں گیہوں، چاول، شکر، کتابیں، اخبار رکھی ہوئی ملتی ہیں اور کالی تھیلی میں مذہب، ایمان، سچائی، ملک کی خدمت اور امن کے پرکٹے ہوئے رکھے ہوتے ہیں۔ سفید تھیلی میں محبت ہوتی ہے اور کالی تھیلی میں سکے ہی سکے ہوتے ہیں۔ جب یہ دنیا ہمارے اصول پر عمل کرنے لگی گی تو دنیا میں ہر طرف سفید تھیلیاں دکھائی دیں گی۔ اس لئے کہو بچو تھ سے تھیلی۔

---

## د ۔ دشمن

بچو دشمن بھی بنیئے اور دوکاندار کی طرح ایک قسم ہے۔ بنیا آٹا، تیل، چاول نمک بیچتا ہے اور اپنے لئے منافع حاصل کرتا ہے۔ دشمن اپنے ملک اور قوم کو بیچتا ہے اور اپنے لئے منافع حاصل کرتا ہے۔ جس طرح بنیا زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے اسی طرح دشمن بھی اپنی آمدنی کو بڑھانے کی کوشش

میں رہتا ہے۔ لیکن خاص بات یہ ہے کہ دنیا میں بنیئے اور زیادہ منافع کرنے والوں کو تو اچھا سمجھا جاتا ہے۔ لیکن بے چارے دشمن کو برا۔ حالانکہ وہ بھی ایک گناہ گار ہے اور انہیں اصولوں پر عمل کرتا ہے۔ جن پر آج کل کی دنیا کا دھندہ چلتا ہے۔ جب تک بزنس کے یہ اصول رہیں گے۔ بنیئے کو اچھا اور دشمن کو برا سمجھنا بالکل ناانصافی ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان میں دشمن کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ جتنے غدار ہندوستان میں پیدا ہوئے دنیا کے کسی حصے میں نہیں۔ ہمارے ملک کے دشمنوں نے آج سے کئی سال پہلے ہمارے ملک کو فروخت کرنا شروع کیا تھا اور اب تک یہ دھندہ چلا آرہا ہے۔ آریہ سے لے کر فرنگی کے زمانے تک یہ ملک بکتا رہا ہے۔

ملک دشمن کی عزت اپنے ملک میں کم اور غیر ممالک میں زیادہ ہوتی ہے یہودیوں کی طرح ملک دشمن دنیا کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں اور انکا کاروبار غیر قانونی ہے۔ غداروں کی ملی بھگت ضروری ہوتی ہے۔ مصیبت کے وقت ایک ملک کا خادم دوسرے کی مدد نہیں کرتا۔ لیکن ایک ملک دشمن دوسرے ملک دشمن کی مدد ضرور کرتا ہے۔

بچو! اگر تم عزت چاہتے ہو تو ملک کے دشمن بنو۔ قوم کے خادم نہ بنو اور کہو دسے دشمن۔

---

دھ ـــ دھن (دولت)

بچو دھن سے ہر چیز خریدی جاتی ہے۔ تم نے یہ کتاب دھن دے کر خریدی، یہ کتاب، یہ دوات، یہ کاغذ، یہ پنسل، یہ سلیٹ، یہ قلم ہر چیز دھن دے کر خریدی ہے۔ دھن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آدمی دنیا کی ہر چیز اس سے خرید سکتا ہے اور خدا سے لیکر خدمت گار تک اپنی پہنچ بنا لیتا ہے۔ دھن دنیا کا بادشاہ ہے۔ گذشتہ دنوں میں دھن یا دام نہیں ہوا کرتے تھے۔ سب لوگ "بے دام" تھے۔ بلکہ یوں کہو "بو دم" تھے۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ اگر میرے پاس چمڑہ ہے اور مجھے گیہوں چاہئے۔

اور تمہارے پاس گیہوں ہیں اور تمہیں چمڑا چاہئے تو تم مجھ سے چمڑا لیتے تھے اور تبادلے میں گیہوں دیتے تھے اور خوشی خوشی گھر چلے جاتے تھے۔ اب صورت یہ ہے کہ میں نہ تو اب تمہیں دھن کے بنا چمڑا دے سکتا ہوں اور نہ تم گیہوں اور نہ ہم خوشی خوشی گھر جا سکتے ہیں۔ کیونکہ آج کل گھر بھی دھن کے بنا نہیں ملتا۔

کئی لوگ کہتے ہیں کہ خوشی کا دھن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے غیر دولت مند کو یہ لفظ کہتے نہیں سنا۔ دھن کے بغیر دنیا میں خوش رہنا مشکل ہے۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ لوگ میرے آرٹ اور ہنر کو دیکھتے تھے اور اس کے بدلے مجھے پندرہ روپے نہیں دیتے تھے۔ بلکہ میری زندگی کی تمام مشکلات حل کر دیتے تھے۔ اب قیمت ادا کرنے کا یہ نیا طریقہ نکالا اور ساری دنیا کی خوشی کو اپنے قبضہ میں کر لیا ہے۔ اس سے تو شاید پہلا طریقہ ہی اچھا تھا۔ اس میں خوشی زیادہ تھی۔ آج کل قیمت زیادہ اور خوشی کم۔ پہلے دام کوڑیوں کے ہوتے تھے۔

انہیں دام نہیں بلکہ چھدام کہتے تھے۔ پھر دام دھات سے بنائے جانے لگے۔ تانبے چاندی، سونا، پیتل، لوہا ان سب دھاتوں سے دام تیار کئے گئے۔ آج کل دام کاغذ سے بنتے ہیں۔ دام جام کو بھی کہتے ہیں۔ اصل میں اس دام اور اُس دام میں بہت تھوڑا سا فرق ہے۔ یہ بھی ایک طرح کا جال ہے، جس میں انسان کی خوشی قید کر دی جاتی ہے۔ بچو ہم سب اس جال میں گرفتار ہیں۔ اس لئے کہو دھ سے دھن۔

---

ن ۔ نیم (اصول)

بچو! ہر کام کا ایک اصول ہوتا ہے۔ ڈھنگ ہوتا ہے۔ ڈھانچہ ہوتا ہے۔ قانون ہوتا ہے۔ اس کے بغیر دنیا میں کوئی کام پورا نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ دنیا میں کوئی قانون یا اصول نہیں چاہتے انہیں ہم غیر اصول کہتے ہیں۔ جو لوگ اصول اور قانون چاہتے ہیں انہیں ہم معزز کہتے ہیں۔ انسان ایک عزت دار آدمی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک کام ایک ہی طرح سے ہو سکتا ہے۔ کام کرنے کے ڈھنگ کئی ہیں اور پھر جب کام کا اصول بدل جاتا ہے تو اس کی حالت بھی بدل جاتی ہے۔

انقلاب زندہ باد کا اصول پرانے اصول سے آرہا ہے اور پرانا اصول اس سے پرانے سے۔ اس لئے اگر ہم سینکڑوں سال گذشتہ کی بہتی ہوئی زندگی کی طرف لوٹ جائیں تو پتہ چلے گا کہ کچھ صدیوں کے بعد اصول بدلتا رہتا ہے اور بدلتا رہے گا ایک دن یہ نیا اصول بھی جو آج ہم تمہیں پڑھا رہے ہیں پرانا ہو جائے گا۔ کیونکہ زندگی اسی کا نام ہے اور جب زندگی بدلتی ہے تو اس کے اصول بھی بدل جاتے ہیں۔ تمہاری آنکھوں کے سامنے اس وقت سماج بدل رہا ہے اور ہماری زندگی

بدل رہی ہے۔ چھکڑے کے بجائے ہوائی جہاز۔ پیڑ کی چھال کے بجائے مرسرائزڈ کپڑا ہے اور زندگی میں ایک کے بجائے سب کی حکومت ہے اور ایک سے محبت کے بجائے سب سے محبت ہے۔

یہ پرانا اصول نہیں ہے نیا اصول ہے۔ یہ بدلنے والے زندگی کا اصول ہے اگر پڑھنا چاہتے ہو تو پڑھو۔ ورنہ موت اور غلامی تو قسمت میں لکھی ہوئی ہے اور تمہارے اس زندگی کے سرمائے کو کوئی تم سے چھین نہیں سکتا۔ اس لئے کہوں سے نیم۔

---

پ ــــ پتلون

بچو! پ سے پتلون ہوتی ہے اور پ سے پائجامہ بھی جو تم اکثر پہنتے ہو۔ اور پ سے پکھا بھی ہوتا ہے۔ جو تمہارے گھر میں اناج اور گنے کے بھوسے سے بنایا جاتا ہے۔ لیکن یہ سب دیسی چیزیں ہیں اور کسی کام کی نہیں اس سے تمہاری سمجھ میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔ اس لئے پ سے پتلون ہی صحیح ہے۔

پتلون پڑھے لکھے لوگ پہنتے ہیں اور جب تم بھی پڑھنا لکھنا سیکھ جاؤ گے تو پتلون پہنا کرو گے۔ پتلون پہننے سے بدن میں چستی رہتی ہے اور دماغ تیز ہوتا ہے۔ درزی ایک پتلون اتنے وقت میں سیتا ہے جتنے وقت میں پائجامے تیار ہوتے ہیں۔ پتلون سینا بڑا مشکل کام ہے۔ اس لئے اگر تمہیں پڑھ لکھ کر پتلون پہننے کا شوق ہے تو ابھی سے پ سے پتلون یاد کرنا شروع کر دو۔ کیونکہ جو آدمی پتلون نہیں پہنتا وہ بے وقوف ہے۔

آدمی پتلون پہنتا ہے اور پتلون پیٹی پہنتی ہے۔ جو کبھی کبھی تو آدمی کے کندھے

تک جاتی ہے۔ پیٹی، پتلون، پڑھنا، پائجامہ۔ یہ سب الفاظ پ سے شروع ہوتے ہیں۔ اس لئے کہو پ سے پتلون۔

---

ف ۔ فاقہ

بچو فاقہ ہندوستان کا من بھانا کھاجہ ہے۔ جس طرح مغرب میں لوگ دن میں ایک بار مکھن، ٹوسٹ اور انڈے ضرور کھاتے ہیں۔ اسی طرح ہندوستان میں لوگ ایک وقت کا فاقہ ضرور کھاتے ہیں۔ فاقہ ہمارے مذہب میں بھی شامل ہے۔ اور یہ ہماری زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ ہے۔

بھوکے رہنے کے کئی فوائد ہیں۔ فاقہ کرنے سے انسان کا دل ہمیشہ خدا کو یاد کرتا رہتا ہے اور کبھی شیطان کی طرف نہیں جھکتا۔ بھوک بھلائی سکھاتی ہے برائی نہیں۔ بھوکے رہنے سے عقل میں اضافہ ہوتا ہے۔ بھوک آدمی کو ہوشیار بناتی ہے سست نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے کئی قوموں میں اس کا رواج ہے۔ فاقے سے بدن کو بھی کئی فائدے ہیں۔ اس سے بدن موٹا نہیں ہوتا۔ اپنی اصلی حالت میں رہتا ہے۔ بلکہ اور بھی کم ہو جاتا ہے۔ بدن کی فالتو چربی گل جاتی ہے اور آنکھوں کی بینائی اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ دن کو تارے نظر آنے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہڈیوں میں بھی ایک خاص لچک پیدا ہو جاتی ہے گوشت سکڑتا ہے۔ ہڈیاں پھیلتی ہیں۔ یہاں تک کہ آدمی کچھ دنوں میں گوشت پوست کا نہیں بلکہ ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آنے لگتا ہے۔

بھوکا رہنے والوں کو (اور ہندوستان میں ہر روز کروڑوں بھوکے رہتے ہیں)

پیٹ کی بیماری کم ہوتی ہے اس لئے بھوکا رہنے سے کبھی بدہضمی نہیں ہوتی۔ پیٹ میں کیڑے نہیں پڑتے۔ آنتوں میں سوجن نہیں ہوتی۔ بھوکے رہنے والوں کو پیٹ کا دھندہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے۔ آج ایک بھارتی کی آمدنی نو نئے پیسے ہے۔

لیکن اب ہمارے ملک کے بڑے بڑے آدمیوں نے ملکر پندرہ سالہ منصوبہ بنایا ہے۔ ہماری سرکار نے بھی پانچ سالہ منصوبہ بنایا تھا۔ جس پر عمل کرنے سے ہندوستان کی بہت سی مشکلات حل ہوجائیں گی۔ یعنی جہاں کہ ہندوستانی ایک دن فاقہ کرتا تھا اب پانچ دن فاقہ کیا کرے گا۔ اس لئے بچو کہو ف سے فاقہ۔

---

ب ــ بچہ

بچو! تم سب بچے ہو۔ بچے وہ ہوتے ہیں جن کے ماں باپ ہوتے ہیں اور انہیں کاغذ، قلم، سلیٹ اور تختی دے کر اسکول بھیجتے ہیں۔ لیکن کئی بچے ایسے ہوتے ہیں۔ جن کے ماں باپ نہیں ہوتے اور وہ اسکول میں پڑھنے کو نہیں جاتے۔ لیکن ان بچوں کو ہم بچے نہیں کہتے یتیم کہتے ہیں۔ دوسروں ملکوں میں تو سو میں سے نوے بچے اسکول میں پڑھتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں سو میں سے صرف دس بچے اسکول میں پڑھتے ہیں۔ باقی بچے آنگن میں گلی ڈنڈا کھیلتے ہیں۔ اس لئے انہیں یتیم کہا جاتا ہے۔

ہندوستان میں دوسرے ملکوں کی بہ نسبت بچے زیادہ پیدا ہوتے ہیں اور مرتے بھی سب سے زیادہ تعداد میں ہیں۔ لیکن زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے اس میں ہمارا کوئی دخل نہیں۔ بچے تو بھگوان اور اللہ بھیجتا ہے اور پھر وہی انہیں

واپس بلا لیتا ہے۔ یہی بائبل میں بھی لکھا ہے۔
اس لئے کہو ب سے بچہ

---

بھ ــ بھلائی

بچو بھلائی اس کو کہتے ہیں جو آدمی بھلا کرتا ہے۔ لیکن اس سے فائدہ دوسرے لوگ اٹھاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر تم اپنے گھر سے میرے لئے آٹا، چاول نمک، تیل وغیرہ لاتے ہو تو تم بھلائی کرتے ہو اور فائدہ مجھے ہوتا ہے اور پھر میں ایک غریب ٹیچر ہوں۔ مجھے پندرہ روپے تنخواہ ملتی ہے اور اس پندرہ روپے میں میرا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اگر تم چاہتے ہو کہ میں زندہ رہوں اور تمہیں میری زندگی سے محبت ہے تو میرے لئے ہمیشہ ہمیشہ آٹا، چاول، نمک، تیل، لکڑی وغیرہ لاتے رہو۔ بھلائی بڑی ہی عمدہ چیز ہے اور انگریزوں نے ایک صدی سے زیادہ ہندوستانیوں پر بھلائی کی ہے۔ اس لئے کہو بھ سے بھلائی۔

---

م ــ منتری (وزیر)

بچو منتری حکم چلاتا ہے۔ منتری ریاست کے سب آدمیوں سے بڑا ہوتا ہے اور منتری سے بڑا صرف گورنر ہوتا ہے یا پریسیڈنٹ ہوتا ہے۔ یا بادشاہ ہوتا ہے۔

تم نے اکثر پریوں کی کہانی میں سنا ہوگا کہ بادشاہ حکومت کرتے ہیں اور وزیر مشورے دیتے ہیں۔ گذشتہ زمانے میں بھی جبکہ پریوں کا زمانہ نہیں تھا۔ منتری

بادشاہ کو صلاح و مشورے دیتے تھے اور بادشاہ ان کے کہنے پر چلتا تھا۔ لیکن آج کل یہ ہوتا ہے کہ بادشاہ یا گورنر صلاح دیتے ہیں اور منتری ان پر عمل کرتے ہیں۔

پریوں کی کہانی میں تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ منتری عقل مند ہوتے ہیں اور بادشاہ بے وقوف۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بادشاہ عقل مند ہے اور منتری بے وقوف۔ لیکن آج کل بادشاہ اور منتری دونوں ہی عقل مند ہوتے ہیں۔ صرف عوام بے قوف ہوتے ہیں اور اگر نہیں ہوتے تو بے وقوف بنائے جاتے ہیں اور اگر پھر بھی نہ بنے تو جیل میں ٹھونس دیئے جاتے ہیں۔ ایسی حکومت کو جمہوری کہتے ہیں

پریوں کے زمانے میں ایک بادشاہ ہوتا تھا اور ایک منتری۔ دونوں الگ رہتے تھے اور دونوں کے کام بھی الگ ہوتے تھے۔ لیکن آج کل کئی ملکوں میں ایک ہی آدمی بادشاہ بھی ہوتا ہے اور منتری بھی۔ یہ خود ہی صلاح دیتا ہے اور خود ہی عمل کرتا ہے۔ ایسا آدمی نہ بادشاہ کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی منتری۔ اسے ڈکٹیٹر کہتے ہیں۔ ڈکٹیٹر اکیلا اپنے ملک میں حاکم ہوتا ہے۔ وہ خود ہی صلاح دیتا ہے اور خود ہی عمل کرتا ہے۔ عوام صرف تالیاں بجاتے ہیں۔ واہ واہ کہتے ہیں اور اپنے خون کی ندیاں بہاتے ہیں۔ کیونکہ ڈکٹیٹر کو خون بہانے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ اس قسم کی حکومت کو زبردستی کی حکومت کہتے ہیں۔

لیکن پریوں کے دیش میں ڈکٹیٹر نہیں ہوتا۔ پریوں کے دیش کی کہانیوں میں صرف بادشاہ، منتری، راج کمار اور شہزادیاں ہوتی ہیں۔ ہند میں سر پھرے لوگ اس کوشش میں ہیں کہ اس دنیا کو بھی پریوں کا دیش بنا دیا جائے۔ جہاں ہر لڑکا شہزادہ اور ہر لڑکی شہزادی ہو۔ آئندہ ایسے لوگوں کے واسطے پاگل خانے کھلنے

والے ہیں۔ جہاں پر انہیں زندہ دفن کر دیا جائے گا۔ اس لئے بچو ان لوگوں کا کبھی بھروسہ نہ کرو اور زور سے کہو م سے منتری۔

---

ی ۔ یاد

بچو اس پرائمری کا بہت ضروری لفظ "ی" یاد ہے۔ یاد کئے بغیر تم پرائمر کو کبھی دماغ میں نہ رکھ سکو گے اور اسے بہت جلد ہی بھول جاؤ گے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم یہ پرائمر بھول جاؤ۔ کیونکہ اگر تم نے یہ پرائمر بھلا دی تو تم اپنے لئے اور اس طرح دنیا کے لئے بھی نئی زندگی نہ بنا سکو گے۔ اس لئے اسے یاد کرو۔ اس پرائمر کو ہمیشہ کے لئے یاد رکھو۔

نئی پرائمر تمہارے لئے کیوں ضروری ہے؟ ممکن ہے کہ میں اس کا تسلی بخش جواب نہ دے سکوں۔ اس لئے نہیں کہ تم بچے ہو۔ بلکہ میں ایک معمولی اسکول ماسٹر ہوں۔ ہاں میں ایک معمولی اسکول ماسٹر ہوتے ہوئے جب آج کی دنیا کو دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس دنیا کو نئے پرائمر کی ضرورت ہے۔

پھر یہ نیا قاعدہ میں تمہیں کیوں پڑھا رہا ہوں۔ کیوں نہ اس قاعدے کو بزرگوں کے پاس لے جاؤں اور ان سے استدعا کروں کہ وہ اس قاعدے کو ساری دنیا میں پھیلا دیں۔ بلکہ میں اپنے قاعدہ کے لئے بچوں سے مدد چاہتا ہوں۔ جو بچے کمزور ہیں، نہتے ہیں۔ بس اس لئے میں تمہارے پاس آیا ہوں۔ کیونکہ تم نہتے ہو کمزور ہو اور بھولے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم کھلونوں سے کھیلتے ہو۔ پریوں سے محبت کرتے ہو۔ درختوں سے بات کرتے ہو۔ تاروں کی نگاہوں کو پہچانتے ہو اور اپنے

دل میں وہ دولت رکھتے ہو جو ڈوبتے ہوئے سورج کے سارے سونے میں نہیں ہے۔ اس لئے میں وہ قاعدہ لے کر تمہارے پاس آیا ہوں کہ تم بڑے ہو کر اس دولت کو دنیا میں پھیلاؤ۔ تاکہ ہر بچے کا لباس ریشم کا ہو جائے۔ اس کی آنکھوں میں خوشی چمک اٹھے وہ پرستان کی کہانی نہ سنے بلکہ خود پرستان میں رہے۔

بچو اگر تم نے نیا قاعدہ یاد رکھا تو تم یہ سب کچھ کر سکو گے اس لئے کہو ہی سے یاد۔

---

ر ــــ راجہ

بچو تم نے راجہ دیکھا ہوگا۔ اگر راجہ نہیں تو راجہ صاحب کا ہاتھی ضرور دیکھا ہوگا۔ ہمیشہ یاد رکھو کہ راجہ صاحب کا ہاتھی ہوتا ہے اور پنڈت جی کی بیل گاڑی ہوتی ہے اور مولوی صاحب کا گھوڑا ہوتا ہے اور غریب کا گدھا ہوتا ہے۔ دھوبی کا کتا ہوتا ہے۔ جو اکثر نہ گھر کا ہوتا ہے اور نہ گھاٹ کا۔ لیکن راجہ صاحب کے پاس صرف ہاتھی ہی نہیں ہوتا سب کچھ ہوتا ہے۔ گھر، گھاٹ، دھوبی، کتا، پنڈت مولوی، ہاتھی، چیتا، بلی، گاڑی، موٹر اور ہیرا۔ راجہ صاحب کی رانی بھی ہوتی ہے۔ بلکہ عام طور پر رانیاں ہوتی ہیں جو عالی شان محلوں میں رہتی ہیں۔ جو عورتیں رانیاں نہیں ہوتیں وہ گھاس پھوس کے جھونپڑے میں رہتی ہیں۔ راجہ کے پاس رعایا بھی ہوتی ہے اور بغیر رعایا کے کوئی راجہ راجہ نہیں کہلا سکتا۔ اس دنیا کا شروع سے یہی اصول چلا آرہا ہے کہ راجہ محل میں رہتے ہیں اور رعایا جھونپڑوں میں۔ وہ تخت پر بیٹھ کر حکومت کرتے ہیں اور رعایا کھیتوں میں ہل چلاتی ہے۔ راجہ شراب پیتا ہے رعایا پانی اور جب

پانی نہیں ملتا تو چپ چاپ بھوکی پیاسی مر جاتی ہے۔ ایسے وقت کو کال کہتے ہیں۔

لیکن وہ دنیا کا پرانا قاعدہ ہے۔ نیا قاعدہ تو تم اب پڑھ رہے ہو۔ نئے قاعدہ قاعدے میں راجہ اور رعایا سب برابر ہیں۔ کروڑوں روپے محلوں پر خرچ کرنے کے بجائے رعایا کے لئے کوارٹر بنائے جاتے ہیں۔ موٹر اور ہاتھی رکھنے کے بجائے کارخانے کھولے جاتے ہیں اور بندیا کو بالکل اڑا دیا جاتا ہے۔ بھلا سر پر بندیا لگانے سے کسی کا پیٹ بھرتا ہے؟ نئے قاعدے میں بندیا لگانے اور ہیرے موتی کے گہنے پہننے پر کتابیں پڑھنے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس لئے نیا قاعدہ پڑھو اور کہو رے راجہ

---

ل ۔ لوہا

بچو تم نے لوہا اکثر دیکھا ہوگا۔ یہ ایک کالے رنگ کی سخت دھات ہے یہ دیکھو تمہارے چاقو کا پھل لوہے کا بنا ہوا ہے۔ سلیٹ کے چاروں طرف جو کھٹے جڑے ہیں وہ لوہے کے ہیں۔ تمہارے قلم میں جو نب لگا ہوا ہے وہ لوہے کا بنا ہوا ہے۔ درزی کی سوئی بھی لوہے کی بنی ہوتی ہے۔ جارج واشنگٹن کا کلہاڑا بھی لوہے کا بنا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوہے سے ان گنت چیزیں بنتی ہیں۔

آج کل لوہے سے مشینیں بھی بنتی ہیں اور مشین گنیں بھی۔ مشینوں کے ذریعہ آدمیوں سے زائد کام لیا جاتا ہے اس سے یہ فائدہ ہوا کہ مشینیں دن بدن بڑھتی چلی گئیں اور انسان کے ہاتھ چھوٹے ہوتے جا رہے ہیں۔

لڑائی ہمیشہ مشین گنوں اور لوہے کے دوسرے ہتھیاروں سے لڑی جاتی ہیں۔

انسانوں کو مارنے کے تمام اوزار لوہے سے بنتے ہیں۔ اس لئے لوہے کو دھاتوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران جتنی زندگیاں برباد ہوئیں اس سے قبل کسی لڑائی میں نہیں ہوئیں۔ صرف اسی ایک بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوہا کتنی اچھی چیز ہے۔ اس لئے جن حکومتوں کے پاس لوہا ہوتا ہے وہ بڑی حکومت اور جن کے پاس لوہا نہیں ہوتا وہ چھوٹی حکومت کہلاتی ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ لوہا انسان کے لئے اتنا کارآمد نہیں ہے جتنا ایک پھول ایک قہقہہ، یا ایک نغمہ، لیکن ایسے لوگوں کو عام طور پر پاگل کہا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں پر ہمیشہ لعن طعن ہوتی رہتی ہے اور وہ اکثر جیلوں یا پاگل خانوں میں بند کر دیئے جاتے ہیں۔ کیونکہ آج کل لوہے کا زمانہ ہے۔ نغموں کا نہیں، قہقہوں کا زمانہ نہیں، پھولوں کا زمانہ نہیں، وہ زمانہ ابھی نہیں آیا اور جب تک وہ زمانہ آئے گا یہ پاگل لوگ موت کے منہ میں جا چکے ہوں گے۔ اب تو لوہے کا زمانہ ہے۔ لوہے اور کوئلے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جہاں یہ دونوں مل جاتے ہیں وہاں انسانی خون کی ندیاں بہنے لگتی ہیں۔ اس لئے کہوک سے کوئلہ۔ خ سے خون اور ل سے لوہا۔

---

## ش ــ شراب

بچو تم نے شاید آدھی رات کو اپنے باپ کو دروازہ کھٹکھٹاتے جھومتے جھامتے گالیاں بکتے اور گنگناتے سنا ہوگا یہ شراب کا اثر ہوتا ہے۔ شراب بڑی اچھی چیز ہے۔ کیونکہ یہ انگور کے رس سے تیار کی جاتی ہے۔ لیکن آج کل انگور کی بیلیں کہیں

دکھائی نہیں دیتیں۔ کیونکہ انہیں ان بچوں نے کاٹ ڈالا ہے۔ جو جارج واشنگٹن کی طرح کندھے پر کلہاڑا لئے پھرتے ہیں۔ اس لئے آج کل شراب انگور کے رس سے نہیں بلکہ مکئی، چاول، جو یا کیڑے مکوڑوں کے رس سے تیار کی جاتی ہے۔ جو چیز جتنی سڑی گلی اور بدبو دار ہوگی اس سے اتنی ہی لذیذ شراب تیار ہوگی۔ یہ شراب کا پہلا اصول ہے۔ شراب کا آخری اصول بیوی بچوں کو مارنا پیٹنا اور گالیاں بکنے پر ختم ہوتا ہے۔ جب شراب تیار ہو جاتی ہے تو اس میں تھوڑی سی کونین بھی ملا دیتے ہیں۔ تاکہ ملیریا کے وہ مچھر جو شراب تیار ہونے پر پیدا ہوتے تھے۔ ختم ہو جائیں۔ اسی لئے تو شراب ترش ہوتی ہے اور شرابی کو کبھی ملیریا نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں لوگ شراب بہت کم پیتے ہیں۔ اس لئے یہاں ہر سال لاکھوں آدمی ملیریا سے مر جاتے ہیں۔ اس لئے بچو اگر تم ملیریا سے بچنا چاہتے ہو اور شاعر بننا چاہتے ہو تو شراب پیو۔ کیونکہ شاعری صرف شراب پینے سے آتی ہے۔

شراب پینے سے آدمی کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔ دلیری، مردانگی اور بہادری کے جوہر دکھانے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے آج کل ہندوستانی شرابیوں کے حوصلے اتنے بڑھ گئے ہیں کہ انہوں نے اپنے ملک کو آزاد کروا لیا ہے۔ اور اپنی حکومت قائم کر لی ہے۔ بچو تم بھی شرابستان کا ساتھ دو اور کہو ش سے شراب۔

---

س سے سرکار

بچو سرکار اسے کہتے ہیں۔ جہاں تھوڑے سے آدمی بہت سے آدمیوں پر

اپنا حق جتلائیں۔ تم سب بچے ہو اور مجھ سے چھوٹے ہو۔ اس اسکول میں میری حکومت ہے۔ لیکن اس تحصیل میں اور بھی بہت سے آدمی رہتے ہیں۔ لیکن اس تحصیل پر صرف ایک تحصیل دار کی حکومت ہے۔ یہ ضلع ایک راج ہے۔ جہاں گورنر کی حکومت ہے۔ راج ایک دیس میں ہے جہاں پریسڈنٹ کی حکومت ہے ملک کامن ویلتھ میں ہے۔ جہاں بادشاہ کی حکومت ہے۔ کامن ویلتھ زمین پر ہے جہاں بھگوان کی حکومت ہے۔ بھگوان دنیا میں ہے۔ جہاں پیسے کی حکومت ہے۔ حکومت کے بنا آدمی سانس بھی نہیں لے سکتا۔ اگر یہ حکومت نہ ہوتی تو یہ اسکول بھی نہ ہوتا۔ نہ تم مجھ سے سبق لیتے اور نہ میں تم کو پڑھاتا۔ یہ بھی حکومت کا کام ہے اس لئے بچو ہمیشہ حکومت کی عزت کرو اور یہ یاد رکھو کہ ہر آدمی حکومت نہیں کر سکتا اور ہندوستانی تو خاص طور پر حکومت نہیں کر سکتا۔ جو لوگ حکومت کرتے ہیں وہ حاکم کہلاتے ہیں اور جن پر حکومت کی جاتی ہے انہیں محکوم کہا جاتا ہے۔ حاکم ہمیشہ رعایا کے فائدہ کی بات سوچتا ہے۔ اس لئے حاکم ہمیشہ امیر ہوتا ہے اور رعایا غریب۔ اگر خدانخواستہ کبھی ایسا ہو جائے کہ حاکم رعایا کے فائدے کے لئے نہیں بلکہ نقصان کے لئے سوچنے لگے تو رعایا امیر اور حاکم غریب ہو جائیں۔ اور یہ اچھی بات نہ ہوگی۔ کیونکہ غریب حاکم کبھی حکومت نہیں چلا سکتا۔ اس لئے حاکم کو ہمیشہ رعایا کے فائدے کی بات سوچنا چاہیئے۔ کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ سرکار کا نام و نشان ہی دنیا سے مٹا دیا جائے ایسے لوگ بہت برے ہوتے ہیں۔ وہ تو س کا لفظ مٹانے پر تلے ہوتے ہیں۔ بچو اب تمہیں بتاؤں کہ اگر "س" کو مٹا دیا جائے تو تم سرکار میں حاکم کیسے بنو گے۔؟

اس لئے ان پاگل آدمیوں کی باتیں کبھی نہ سنو اور کہو س سے سرکار۔

---

۵ ۔ ہندو

بچو ہندوا سے کہتے ہیں جو مسلمان کا دشمن ہو۔ وہ کام کرے جو مسلمان نہ کرتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان گوشت کھاتے ہیں اور ہندو ترکاری۔ مسلمان سر منڈواتا ہے ہندو سر پر چوٹی رکھتا ہے۔ مسلمان گائے کو حلال کرتا ہے اور ہندو اسے اپنی ماں سمجھتا ہے اور پوجا کرتا ہے۔ مسلمان سؤر کو حرام سمجھتے ہیں۔ ہندو اس کا اچار ڈالتے ہیں۔ مسلمان مسجد میں جاتا ہے۔ ہندو مندر میں۔ مسلمان چپ چاپ نماز پڑھتا ہے۔ ہندو سنکھ اور گھنٹیاں بجا کر پوجا کرتا ہے۔ اس پر بھی ہندو اور مسلمان دونوں بھائی بھائی ہیں۔

ہندو پرتھوی راج چوہان کی عزت کرتا ہے۔ مسلمان شہاب الدین غوری کی۔ ہندو رانا سانگا کو پوجتا ہے اور مسلمان بابر کی شان میں قصیدہ پڑھتا ہے۔ ہندو رانا پرتاپ کو بڑا سمجھتا ہے مسلمان اکبر کو رانا پرتاپ سے زائد سمجھتا ہے۔ ہندوؤں کا ہیرو شیواجی ہے اور مسلمانوں کا اورنگ زیب اس پر ہندو مسلمان بھائی بھائی ہیں۔

ہندو جس محلے میں رہتا ہے وہاں مسلمان کو گھسنے نہیں دیتا۔ ہندو جس چوک میں کھانا کھاتا ہے وہاں سے مسلمان گزر نہیں سکتا۔ ہندو جس کمرے میں سوتا ہے وہاں مسلمان کا سایہ بھی نہیں پڑ سکتا۔ ہندو جل پیتا ہے مسلمان پانی۔ مسلمان مر کر گاڑا جاتا ہے اور ہندو آگ پر جلایا جاتا ہے اس پر بھی ہندو مسلمان بھائی

بھائی ہیں۔

ہندو مسلمان کو غیر مذہب قرار دیتا ہے اور مسلمان ہندو کو کافر کہتا ہے ہندو کی زبان سنسکرت ہے مسلمان کی عربی۔ ہندو ٹیگور کو مشرق کا شاعر کہتے ہیں اور مسلمان اقبال کو۔ ہندو اکھنڈ ہندوستان چاہتا ہے اور مسلمان پاکستان۔ اس پر بھی ہندو مسلمان بھائی بھائی ہیں۔

اگر مسلمان اور ہندو بھائی بھائی ہیں تو دشمن کے لئے ایک نیا لفظ تلاش کرنا پڑے گا۔ لیکن جب تک کوئی ایسا لفظ نہیں تلاش کیا جاتا تم یہی سمجھو کہ ہندو مسلمان کا دشمن ہے اور ہندو مسلمان دونوں بھائی بھائی ہیں اور یہ دونوں ایک ہی ملک میں رہتے ہیں، جس کے بارے میں کہا گیا ہے۔

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا"

اسی ملک میں جہاں ہندو مسلمان بستے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں۔ جو اپنے آپ کو انسان کہلوانا پسند کرتے ہیں خدا کے بندے! لیکن یہ ان لوگوں کی غلط فہمی ہے۔ یہ لوگ خدا کے بندے نہیں ہیں۔ ناستک ہیں۔ خطرناک بھیڑیئے۔ بچو تم ان آدمیوں کو جہاں دیکھ پاؤ وہیں ان کے منہ پر تھوکو۔ کیونکہ انسپکٹر صاحب کا یہی حکم ہے۔

ہندو مسلم بھائی بھائی ہیں اور ایک دوسرے کو بھائی کہتے ہیں۔ دیش بھائی جب ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے ہیں تو دنگا فساد ہو جاتا ہے۔ دنگا فساد بڑے مزے کا کھیل ہے اور یہ کھیل ہندوستان میں اکثر کھیلا جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں ہندو اور مسلمان بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ عام طور پر دنگا فساد پنڈت اور مولوی سے شروع ہو کر دفعہ ۱۴۴ پر ختم ہوتا ہے اور اس دوران میں خون کی ندیاں بہہ جاتی ہیں۔ جس پر ہندو مسلمان

خوشی خوشی نہاتے ہیں۔ اس کے بعد پولیس جھگڑے پر قابو پالیتی ہے اور پھر دوسرے جھگڑے فساد کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ بڑے مزے کا کھیل ہے چونکہ ہندو مسلمانوں کو کبھی اس کھیل سے فرصت نہیں ملی۔ اس لئے انہوں نے یہ کام بہت دنوں تک انگریزوں کو سونپے رکھا کہ وہ ہمیشہ ان دونوں بھائیوں کا فیصلہ کرتے رہیں۔ یہی وجہ ہے انگریزوں کو منصف کہا جاتا ہے۔ لیکن ملک میں ایسے بے وقوفوں کی تعداد بہت کم ہے اس لئے کہو کاسے ہندو۔

---

گ ۔ گیان (علم)

بچو اس وقت تم اس پرائمر کا آخری لفظ پڑھ رہے ہو۔ لیکن آخر میں آنے کی وجہ سے اس کی اہمیت کوئی کم نہیں ہے۔ دنیا میں سب سے عمدہ چیز علم ہے جو تم مجھ سے سیکھ رہے ہو۔ جب تم علم سیکھ جاؤ گے تو میری طرح عامل کہلاؤ گے اور ہر ماہ پندرہ روپے تنخواہ پاؤ گے۔ بچو علم بہت اچھی چیز ہے اسے نہ چور چرا سکتا ہے اور نہ ہی آگ جلا سکتی ہے۔ نہ راجہ چھین سکتا ہے۔ نہ بھائی بٹوارہ کر سکتا ہے۔ اس لئے جب عامل مرجاتا ہے تو سب علم اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور اپنے بیوی بچوں کو بھوکا مرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کیونکہ علم بڑی دولت ہے۔ علم مرد کا زیور ہے۔ جس طرح عورت کا سونا۔ لیکن کئی چیزیں دولت کے بغیر بھی اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ جیسے چاند۔ ہر بچہ شروع میں چاند کی طرح ہوتا ہے لیکن پڑھ لکھ کر بڑا آدمی ہو جاتا ہے اور نوکری تلاش کرتا ہے۔ کیونکہ علم سے نوکری ملتی ہے اور نوکری سے تنخواہ ملتی ہے۔ دیکھو میں اس اسکول میں ملازم ہوں اور پندرہ روپے ماہوار تنخواہ پاتا ہوں۔ پندرہ روپے دولت کو کہتے ہیں اور پندرہ ہزار

روپے بھی دولت کو کہتے ہیں اور پندرہ لاکھ کو بھی دولت کہتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ استاد کو پندرہ روپے کی دولت ملتی ہے اور کارخانے دار کو پندرہ لاکھ۔ لیکن دولت ہر حالت میں دولت ہے وہ صرف پندرہ روپے ہوں یا پندرہ لاکھ۔ اس لئے ہر استاد کو اپنی دولت پر شکر گزار ہونا چاہئے۔ کیونکہ علم بڑی دولت ہے۔ بچو علم سیکھو اور یہ نہ سیکھو گے تو تمہیں نوکری نہ ملے گی اور جب نوکری نہ ملے گی تو دولت کہاں سے پاؤ گے اور ایسی صورت میں تم کیا کرو گے۔ حلوائی کی دوکان کھولو گے یا جوتے بناؤ گے یا کارخانے میں کام کرو گے۔ اس لئے بچو علم ضرور سیکھو۔ علم کے بغیر نوکری نہیں مل سکتی۔ اور عزت حاصل نہیں ہو سکتی اس لئے کہو گ سے گیان (علم)

پہلا سبق

انگریز انسان ہیں۔ ملایا والے بھی انسان ہیں۔ انسان انسان پر حکومت کرتا ہے حکومت چور کو سزا دیتی ہے۔ چور ڈاکو کا چھوٹا بھائی ہے۔ سب انسان بھائی بھائی ہیں۔

موہن آم کھاتا ہے۔ بنیا سود کھاتا ہے۔ ٹامی مکھن کھاتا ہے۔ بنگالی بھوکا رہتا ہے۔ راجہ محل میں رہتا ہے۔ رانی ریشم کے کپڑے پہنتی ہے۔ میری بہن کا نام رانی ہے لیکن اس کے پاس ریشم کے کپڑے نہیں۔

خربوزہ کھا۔ خربوزہ نہ بن۔ مہینے سے مر بھوک سے نہ مر۔ گالی بک چپ نہ رہ۔ یہ فروٹ کا میوہ ہے اس کو برآمد کر۔

راجہ آیا۔ ہاتھی آیا۔ ڈاکو آیا۔ کال آیا۔ گودام کہاں ہیں۔ یہ تو کاغذ کا گودام ہے۔ اناج کا گودام کہاں ہے؟ پہلوان بن چوہا نہ بن۔ گودام پر قبضہ جما۔

دوسرا سبق۔

آج امن ہے کل لڑائی ہوگی۔ پرسوں پھر صلح ہو جائے گی۔ اسی کا نام دنیا ہے۔ ہندو مسلمان دنگا فساد کرتے ہیں۔ ہندو جل پیتا ہے۔ مسلمان پانی پیتا ہے۔ انسان کے لئے پانی کہاں ہے؟ کہیں نہیں ہے۔

شراب انگور سے بنتی ہے۔ غلامی وفاداری سے آتی ہے۔ کتا بڑا وفادار جانور ہے۔ بھیڑیا جنگل میں رہتا ہے۔ کتے کے گلے میں زنجیر ہے۔ زنجیر کو توڑ دے دودھ کا پیالہ پھوڑ دے۔

موہن بڑا اچھا طوطا ہے۔ یہ جان کر پنجرے میں بولتا ہے۔ ہپ ہپ ہرے۔

موہن ہندو ہے۔ امجد مسلمان ہے۔ ہندو مسلمان کا دشمن ہے۔ موہن اور امجد بھائی بھائی ہیں۔ بھائی بھائی لڑتے ہیں۔ غدار ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

تیسرا سبق۔

ڈکٹیٹر خون بہاتا ہے۔ پریوں کے ملک میں ڈکٹیٹر نہیں ہوتا۔ ماسٹر کے پاس پندرہ روپے ہیں۔ کارخانے والے کے پاس لاکھوں روپے ہیں۔ ہندوستانی کے پاس ڈیڑھ آنہ ہے۔ پندرہ سال کے بعد ہندوستانی کے پاس چار آنے ہوں گے پندرہ سال میں پانچ ہزار چار سو پچھتر دن ہوتے ہیں۔ ہندوستانی چالیس کروڑ ہیں۔ ہندوستان میں بلبلیں رہتی ہیں۔

بچہ ننگا پھرتا ہے۔ پتلون نہیں پہنتا۔ پتلون پہنے گا تو نوکری ملے گی۔ نوکری

سے عزت ملتی ہے۔ نوکری کر۔ بیوی لا۔ حرام حاصل کر۔ موہن کے پاس بہت دولت ہے۔ موہن کے پاس ایک چھدام بھی نہیں۔ موہن غریب ہے۔ غریب چوری کرتا ہے۔ حاکم حکومت کرتا ہے۔

راجہ تخت پر بیٹھتا ہے۔ رعایا ہل چلا رہی ہے۔ یہ جھونپڑہ ہے وہ محل ہے گالی نہ بک۔ نیا قاعدہ پڑھ۔ پرانا قاعدہ بھول جا۔

گھر جا۔ ڈاکو سے لڑ۔ پنجرہ کھول دے۔ آج رات ہے۔ کل صبح ہوگی۔ سورج نکلے گا۔ نیا انسان پیدا ہوگا۔ بچے کھیلیں گے۔ قہقہے لگائیں گے۔ گیت گائیں گے۔

---